تدبّرِ قرآن

۳۷

الصّٰفّٰت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ——— سورۂ یٰسٓ ——— کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے، دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ توحید، قیامت اور رسالت کے اصولی مباحث جس طرح اس گروپ کی پچھلی سورتوں میں زیرِبحث آئے ہیں اسی طرح اس میں بھی زیرِبحث آئے ہیں البتہ نہجِ استدلال اور ترتیبِ بیان مختلف ہے۔ توحید جو اس پورے گروپ کی روح ہے، اس سورہ میں بھی نمایاں ہے۔ لیکن اس میں اس کے ایک خاص پہلو ——— الوہیتِ ملائکہ کے تصور کے ابطال ——— کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لیا ہے۔ احوالِ قیامت کی تصویر اس میں ایسے زاویہ سے پیش کی گئی ہے جس سے مشرکین کے عوام اور ان کے لیڈروں کی باہمی تو تکار سامنے آتی ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی پوری تاریخ بھی اس میں اجمالاً بیان ہوئی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جن قوموں نے رسولوں کی تکذیب کی اللہ تعالیٰ نے ان کو مٹا دیا؛ فلاح صرف رسولوں اور ان کی پیروی کرنے والوں کو حاصل ہوئی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کا اجمالی تجزیہ یہ ہے۔

(۱-۱۰) ملائکہ خدا کے حضور میں ہمیشہ اس کے احکام کی تعمیل کے لیے حاضر اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔ وہ اپنے عمل سے شہادت دے رہے ہیں کہ وہ خدا کے نہایت فرمانبردار اور اطاعت گزار بندے ہیں نہ کہ اس کے شریک، جیسا کہ نادانوں نے سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرب صرف ملائکہ کو حاصل ہے، جنّات و شیاطین کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک نہیں ہے۔ اگر وہ ملاءِ اعلیٰ کی باتوں کی کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں تو ملائکہ ان کو دھتکارتے اور شہابِ ثاقب ان کا تعاقب کرتے ہیں اس وجہ سے وہ غائب کی باتیں جاننے سے قاصر ہیں۔ جو لوگ ان کو علم غیب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے مرتبۂ بلند سے بے خبر ہیں۔

(۱۱-۳۹) ان لوگوں کو تنبیہ جو قیامت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ قیامت کے دن ان کا اور ان کے لیڈروں کا

جو حال ہوگا اس کی تصویر۔ مقصود اس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ ان کے مغرورانہ رویہ کو ابھی نظر انداز کرو۔ وہ دن آنے والا ہے جب ان کے عوام اپنے لیڈروں پر لعنت کریں گے کہ انھوں نے ان کو پیغمبر کی پیروی سے روکا اور لیڈر اپنے پیروؤں کو ملامت کریں گے کہ وہ خود شامت زدہ تھے کہ انھوں نے حق کے واضح ہو جانے کے بعد اس کا انکار کیا۔

(۴۰ - ۶۱) ان اہلِ ایمان کا صلہ جو گمراہ کرنے والے ساتھیوں اور لیڈروں کے علی الرغم رسول کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ان کو قیامت کے دن جو سرورِ ابدی حاصل ہوگا اس کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ۔

(۶۲ - ۷۰) باپ دادا کی اندھی تقلید کے جنون میں رسول اور اس کے طریقہ کی مخالفت کرنے والوں کو جس انجام سے سابقہ پیش آئے گا اس کی طرف اشارہ۔

(۷۱ - ۱۴۸) تاریخ کی شہادت کہ جن قوموں کو اللہ تعالیٰ نے کسی رسول کے ذریعہ سے انذار کیا اگر انھوں نے رسول کی تکذیب کر دی تو ہلاک کر دی گئیں۔ صرف وہ لوگ خدا کی پکڑ سے محفوظ رہے جنھوں نے رسول کی پیروی کی۔ اللہ کی رحمت و برکت، اللہ کے رسولوں اور ان کی پیروی کرنے والوں ہی کے لیے ہے۔

(۱۴۹ - ۱۸۲) خاتمۂ سورہ جس میں کلام تمہید کے مضمون سے پھر مربوط ہو گیا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی زبانی یہ شہادت دلائی گئی ہے کہ فرشتوں کی جماعت برابر خدا کے احکام کی تعمیل اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتی ہے اور ہم خدا کے فرماں بردار بندے ہیں نہ کہ اس کے شریک و شفیع۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ کی مدد اور غلبہ تمھارے اور تمھارے ساتھیوں ہی کے لیے ہے۔ تمھارے مخالفین لازماً ناکام ہوں گے جو پہلے تو رسول کی بعثت کے منتظر رہے لیکن جب وہ آیا تو حسد و تکبر کے سبب سے اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تم ان سے درگزر کرو اور صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ سلامتی اللہ کے رسولوں ہی کے لیے ہے۔

سُوْرَةُ الصّٰٓفّٰتِ (۳۷)

مَكِّيَّةٌ —— اٰيَاتُهَا ۱۸۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۰

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ﴿۲﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ﴿۳﴾ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ﴿۵﴾ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ ﴿۶﴾ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ﴿۷﴾ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿۸﴾ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿۹﴾ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾

ترجمہ آیات ۱-۱۰

شاہد ہیں صفیں باندھے، حاضر رہنے والے فرشتے؛ پھر زجر کرنے والے (شیاطین کو)؛ پھر ذکر کرنے والے (اپنے رب کا) کہ تمھارا معبود ایک ہی ہے۔ وہی خداوند ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا۔ اور وہی خداوند ہے سارے اطرافِ مشرق کا۔ ۱۔۵

بے شک ہم ہی نے سجایا ہے سماءِ دنیا کو ستاروں کی زینت سے اور اس کو محفوظ کیا ہے اچھی طرح ہر سرکش شیطان کی دراندازی سے۔ اور وہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف کان نہیں لگانے پاتے اور وہ ہر جانب سے دھتکارے جاتے ہیں کھدیڑنے کے لیے اور ان کے لیے ایک دائمی عذاب

ہے۔ مگر یہ کہ کوئی اچک لے کوئی بات تو ایک دمکتا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۶-۱۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا (۱)

قسم شہادت کے لیے

'وَ' قسم کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو قسمیں کھائی ہیں یہ تعظیم کے لیے نہیں بلکہ مقسم علیہ پر شہادت کے لیے ہیں۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ 'الامعان فی اقسام القرآن' میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔ ہمارے قلم سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔ قسم کے اس مفہوم کی روشنی میں 'وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا' کا ترجمہ 'شاہد ہیں صفیں باندھے ہوئے حاضر رہنے والے فرشتے' کیا جائے تو یہ قسم کے مفہوم کو بالکل ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والا ہوگا۔

صافات فرشتوں کی صفت ہے

'صٰٓفّٰتٌ' یہاں فرشتوں کی صفت کے طور پر آیا ہے اور اس کی وضاحت اسی سورہ میں خود حضرت جبریلؑ کی زبانی ہو گئی ہے۔ ان کا ارشاد نقل ہوا ہے: 'وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ' (۱۶۴-۱۶۶) (اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک معین مقام ہے اور ہم تو صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم تو تسبیح کرتے رہنے والے ہیں)۔

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان فرشتوں کا ذکر ہے جو ملاء اعلیٰ کے زمرے سے تعلق رکھتے اور عرش الٰہی کے اردگرد صف بستہ رہتے ہیں۔ سورۂ زمر میں ان کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: 'وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (۷۵)' (اور تم دیکھو گے فرشتوں کو گھیرے ہوئے عرش کے اردگرد، اپنے رب کی تسبیح کرتے ہوئے اس کی حمد کے ساتھ)۔

فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (۲)

دوسری صفت

'زجر' کے معنی جھڑکنے، ڈانٹنے اور دھتکارنے کے ہیں۔ یہ انہی فرشتوں کی دوسری صفت بیان ہوئی ہے کہ اگر شیاطین ملاء اعلیٰ کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ان کو دھتکارتے ہیں۔ شیاطین کو ملاء اعلیٰ سے دور رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام بھی فرمایا ہے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا (۳)

تیسری صفت

یہ ان فرشتوں کی تیسری صفت ہے۔ تلاوتِ ذکر سے مراد وہی چیز ہے جو سورۂ زمر میں 'يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ' کے الفاظ سے اور اس سورہ میں 'وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ' کے الفاظ سے مذکور ہوئی ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

صفات میں ترتیب

یہاں عربی زبان کا یہ قاعدہ پیشِ نظر رہے کہ جب صفات کا بیان اس طرح 'فَ' کے ساتھ ہو جس

طرح یہاں ہے تو یہ دو باتوں پر دلیل ہوتا ہے۔ ایک اس بات پر کہ یہ تمام صفات ایک ہی چیز کی ہیں اس وجہ سے جن لوگوں نے ان صفات کے الگ الگ موصوف قرار دیے ہیں ان کی رائے ہمارے نزدیک عربیت کے خلاف ہے۔ دوسری اس بات پر کہ ان صفات میں ایک تدریجی ترتیب ہے۔ ہم نے جو تاویل کی ہے اس سے پہلی بات تو بالکل واضح ہے کہ یہ تمام صفات ملائکہ کی ہیں۔ رہی دوسری بات تو غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان صفات میں اسی طرح کی ترتیب ہے جس طرح کی ترتیب ہماری نمازوں میں ہوتی ہے جس طرح ہم خدا کے سامنے صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں، پھر شیطان سے تعوّذ کرتے ہیں، پھر اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے ہیں اسی طرح ملائکہ بھی عرشِ الٰہی کے اردگرد صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں، پھر شیاطین کو زجر کرتے ہیں، پھر اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (۴)

مقسم علیہ

یہ اس قسم کا مقسم علیہ ہے۔ فرشتوں کی اس بندگی اور اس حمد و تسبیح کو شہادت میں پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ تمھارا رب ایک ہی ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جن لوگوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کو خدائی میں شریک کر رکھا ہے اور ان کی شفاعت کی امید پر ان کی پوجا کر رہے ہیں وہ بالکل حماقت میں مبتلا ہیں۔ فرشتوں کا خود اپنا طرزِ عمل ان نادانوں پر ایک کھلی ہوئی نکیر ہے۔ اس لیے کہ وہ برابر خدا کی بندگی اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں اور یہ احمق لوگ ان کو شریکِ خدا بنا کر ان کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (۵)

یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔ یعنی وہی اللہ واحد تمام آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا خداوند ہے اور وہی تمام مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس نے اپنی ناپیداکنار مملکت کے دور دراز گوشوں کا انتظام اپنے دوسرے شریکوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنی کائنات کے ہر گوشے اور کونے کا مالک خود ہے اور خود ہی اپنے احکام کے تحت اس کا انتظام فرماتا ہے۔ اس کائنات میں فرشتوں کا اگر کوئی دخل ہے تو خدا کے شریک کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے فرمانبردار سفیروں اور کارندوں کی حیثیت سے ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اپنے رب کے احکام کی تعمیل میں کرتے ہیں۔

جمع کے استعمال کا ایک خاص محل

'رَبُّ الْمَشَارِقِ' میں 'مَشَارِق' جمع اپنے اطراف کی وسعت کے اعتبار سے ہے۔ سورۂ اعراف میں لفظ 'اعراف' کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ جمع بعض مرتبہ کسی شے کی وسعت اور اس کے طول کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتی ہے۔ قرآن میں 'مشارق' اور 'مغارب' کے الفاظ اسی اعتبار سے آئے ہیں۔ اسی طرح جہاں مقصود کسی شے کے دونوں کناروں کی طرف اشارہ کرنا ہو وہاں اس کو بعض اوقات تثنیہ کی شکل میں لاتے ہیں چنانچہ

قرآن میں 'مشرقین' اور 'مغربین' بھی استعمال ہوئے ہیں۔ 'رَبُّ الْمَشَارِقِ' کے بعد 'رَبُّ الْمَغَارِبِ' بربنائے وضاحت قرینہ حذف ہے۔ اس لیے کہ 'مغارب' 'مشارق' کے تحت ہیں۔ جب اصل کا ذکر آگیا تو فرع کا ذکر گویا خود بخود ہو گیا۔ بعض جگہ اس کو واضح بھی فرمادیا ہے۔ مثلاً: 'فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ' (المعارج ۴۰) (پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشارق اور مغارب کے رب کی کہ بے شک ہم قادر ہیں)۔ 'مشارق' کے خاص اہتمام کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دنیا میں مشرکوں نے سب سے زیادہ پرستش سورج کی کی ہے جو مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۣ الْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (۶-۷)

شیاطین جن کی تردید

اوپر کی آیات میں ملائکہ کا ذکر ہوا ہے کہ نادانوں نے ان کو خدائی کا درجہ دے رکھا ہے اور ان کے ملاء اعلیٰ تک کا حال یہ ہے کہ وہ برابر اپنے رب کے آگے صف بستہ اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔ اب آگے کی آیات میں شیاطین جن کا ذکر آ رہا ہے کہ نادانوں نے ان کی نسبت یہ گمان کر رکھا ہے کہ ان کی رسائی ملاء اعلیٰ تک ہے اور وہ وہاں سے غیب کی خبریں حاصل کرتے ہیں چنانچہ اسی توقع پر ان کی پرستش کی جاتی ہے کہ یہ علم غیب کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ حالانکہ ملاء اعلیٰ تک کسی کی بھی رسائی نہیں ہے۔ اگر کوئی شریر جن وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے۔

'وَحِفْظًا' فعل محذوف کی تاکید ہے۔ یعنی 'وَحَفِظْنٰهَا حِفْظًا' اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آسمان کو ہم نے شیاطین کی دراندازی سے اچھی طرح محفوظ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ستارے ایک طرف تو آسمان زیریں کی زینت ہیں، دوسری طرف قدرت ان سے یہ کام بھی لیتی ہے کہ جو شیاطین ملاء اعلیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو انہی ستاروں کے ذریعے سے سرزنش کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً: 'وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ' (الملک: ۵) (اور ہم نے سماء دنیا کو تاروں سے سجایا ہے اور ان کو شیاطین کے سنگسار کرنے کے لیے بھی بنایا ہے) دوسرے مقام میں ہے: 'وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ' (الحجر: ۱۶-۱۸) (اور ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے ستاروں سے مزین کیا ہے اور اس کو ہر شیطان رجیم سے محفوظ کیا ہے اور اگر کوئی چھپ کے ملاء اعلیٰ کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہے تو ایک دہکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے)۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۸-۹)

'لَا يَسَّمَّعُوْنَ' یہ نفی فعل، نفی فائدہ فعل کے پہلو سے ہے۔ یعنی شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں سننے کی

کوشش کرتے تو ہیں لیکن وہ کان لگانے پاتے نہیں، جب وہ یہ کرنا چاہتے ہیں تو ہر جانب سے ان پر سنگ باری ہوتی ہے۔ 'دُحُوْرٌ' کے معنی دھتکارنے اور کھدیڑنے کے ہیں اور 'وَاصِبٌ' کے معنی دائم کے۔ یعنی اس دنیا میں تو وہ اس طرح ملعون و مرجوم رہیں گے اور آخرت میں ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہے۔

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۱۰)

یعنی قدرت کے اس محکم انتظام کے بعد اس بات کا تو امکان ہے نہیں کہ کوئی شیطان ملاءِ اعلیٰ تک پہنچ سکے یا ان کی باتیں سن سکے۔ کوئی شریر جن اگر کچھ کر سکتا ہے تو یہ کر سکتا ہے کہ اچکوں کی طرح کوئی بات اچکنے کی کوشش کرے۔ سو اس کے سدِ باب کے لیے بھی یہ انتظام ہے کہ آسمان کی برجیوں سے ایک دہکتا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ نہ فرشتوں کو خدا کی خدائی میں کوئی دخل ہے اور نہ جنات کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک ہے کہ وہاں سے وہ غیب کی کوئی خبر معلوم کر سکیں اس وجہ سے جو لوگ فرشتوں کو خدا کی چہیتی بیٹیاں سمجھ کر پوج رہے ہیں وہ بھی احمق اور جو جنات کو علمِ غیب کا وسیلہ سمجھ کر ان سے تعلق و توسل پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بھی احمق۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عربوں کے شرک اور ان کی کہانت کی تمام گرم بازاری انہی دو مذکورہ تصورات پر تھی۔ قرآن نے یہاں جنوں اور فرشتوں دونوں کی حقیقت واضح کر کے ان کی ضلالت کے اس سارے کاروبار کو ختم کر دیا۔

۲۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۱۱ - ۷۴

آگے احوالِ قیامت کی تفصیل ہے اور مقصود اس سے یہ دکھانا ہے کہ جو لوگ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں قیامت کے دن ان کا اور ان کے معبودوں کا کیا حال ہونا ہے۔ شرک کے علم بردار لیڈر اور ان کے پیرو کس طرح ایک دوسرے پر لعنت کریں گے! اور اہلِ ایمان، جو تمام مخالفتوں کے علی الرغم توحید اور قیامت کے عقیدے پر جمے رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان کو کس فوزِ عظیم سے نوازے گا! ——— آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱-۷۴

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَوَاٰبَاۗؤُنَا

الْاَوَّلُوْنَ ﴿١٧﴾ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿١٨﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ
وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿١٩﴾ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ
الدِّيْنِ ﴿٢٠﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢١﴾ ع
اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿٢٢﴾
الربع مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿٢٣﴾ وَقِفُوْهُمْ
اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿٢٤﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿٢٥﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ
مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٧﴾
قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿٢٨﴾ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا
مُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا
طٰغِيْنَ ﴿٣٠﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿٣١﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمْ
اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿٣٢﴾ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾ اِنَّا
كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿٣٤﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ
مَّجْنُوْنٍ ﴿٣٦﴾ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣٧﴾ اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا
الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ﴿٣٨﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٣٩﴾ اِلَّا
عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٤٠﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۚ
وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٤٢﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٤٣﴾ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿٤٤﴾
يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿٤٦﴾

لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ
عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ
يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ
لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا
لَمَدِيْنُوْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِىْ سَوَآءِ
الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّىْ
لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى
وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۰﴾ لِمِثْلِ
هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾
اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِىْ اَصْلِ
الْجَحِيْمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ
مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ
حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ
ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمْ عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۷۴﴾

ع ۲ ۵۳ ۶

ترجمہ آیات ۱۱-۱۲

پس ان سے پوچھو کہ کیا ان کے پیدا کرنے کا معاملہ زیادہ سخت ہے یا ان چیزوں
کا جو ہم نے پیدا کی ہیں! ہم نے ان کو تو چپکتی مٹی سے پیدا کیا ہے! بلکہ تم تعجب کر رہے ہو

اور یہ لوگ مذاق اڑا رہے ہیں، اور جب ان کو یاددہانی کی جاتی ہے تو وہ دھیان نہیں کرتے۔ اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے ہیں یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو پھر ہم اٹھائے جائیں گے! اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی! ۱۱-۱۷

ان کو جواب دے دو کہ ہاں تم اٹھائے بھی جاؤ گے اور ذلیل بھی ہو گے۔ بس وہ تو ایک ہی ڈانٹ ہو گی پس وہ تاکنے لگیں گے۔ اور کہیں گے، ہائے ہماری شامت! یہ تو جزا کا دن ہے! یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے! ۱۸-۲۱

جمع کرو ان کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے ہم مشربوں کو اور ان کو جن کی یہ اللہ کے سوا پرستش کرتے رہے ہیں پھر ان سب کو دوزخ کا رستہ دکھاؤ۔ اور ان کو ذرا روکو، ان سے کچھ پوچھنا بھی ہے! کیا بات ہے، اس وقت تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کر رہے ہو! بلکہ یہ تو آج بڑے ہی فرماں بردار بنے ہوئے ہیں! ۲۲-۲۶

اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے، پوچھتے ہوئے۔ کہیں گے، تم ہی ہمارے پاس آتے تھے داہنے سے ...... وہ جواب دیں گے، بلکہ تم لوگ خود ایمان لانے والے نہیں تھے۔ اور ہمارا تمھارے اوپر کوئی زور تو تھا نہیں بلکہ تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔ پس ہمارے اوپر ہمارے رب کی بات پوری ہو کے رہی۔ ہم کو اس کا مزا چکھنا ہی ہو گا۔ ہم نے تم کو گمراہ کیا، ہم خود بھی گمراہ تھے۔ پس وہ سب اس دن عذاب میں شریک ہوں گے۔ ۲۷-۳۲

ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کریں گے۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب ان سے کہا جاتا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو یہ اکڑتے اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک شاعر دیوانہ کے کہنے

سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں! بلکہ وہ حق لے کر آیا ہے اور وہ رسولوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے۔ ۳۷-۳۴

بے شک تم کو دردناک عذاب چکھنا پڑے گا۔ اور یہ تو تم اسی کا بدلہ دیے جا رہے ہو جو تم کرتے رہے ہو۔ پس اللہ کے مخصوص بندے ہی اس سے محفوظ رہیں گے۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے معلوم رزق ہوگا۔ میوے، اور وہ نعمت کے باغوں میں بڑی عزت سے ہوں گے۔ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان کے لیے شرابِ مَعین کے جام گردش میں ہوں گے۔ بالکل صاف شفّاف، پینے والوں کے لیے لذّت ہی لذّت! نہ اس میں کوئی ضرر ہوگا اور نہ وہ اس سے نڈھال ہوں گے۔ اور ان کے پاس باحیا، غزال چشم حوریں ہوں گی گویا کہ شترمرغ کے محفوظ انڈے ہیں۔ ۴۸-۳۸

پس وہ ایک دوسرے کی طرف پوچھتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ساتھی تھا جو کہا کرتا تھا کہ کیا تم بھی قیامت کی تصدیق کرنے والوں میں ہو! کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹّی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو ہم بدلہ پانے والے بنیں گے! کہے گا ذرا جھانک کے دیکھو تو سہی! تو وہ جھانکے گا اور اس کو جہنم کے بالکل بیچ میں دیکھے گا کہے گا، خدا کی قسم! تم تو مجھے تباہ ہی کر دینے والے تھے! اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں بھی آج پکڑا ہوا ہوتا۔ ہے نا یہ حقیقت کہ اب ہم پہلی موت کے بعد کبھی مرنے والے نہیں اور نہ ہم پر عذاب ہوگا! بے شک بڑی کامیابی یہی ہے! جس کو کوشش کرنی ہو وہ اس کے لیے کوشش کرے!! ۶۱-۴۹

ضیافت کے لیے یہ بہتر ہے یا درختِ زقّوم! ہم نے اس کو ظالموں کے لیے ایک

فتنہ بنایا ہے۔ وہ ایسا درخت ہے جو قعرِ دوزخ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برگ و بار گویا شیاطین کے سر ہوں۔ وہ لوگ اسی کو کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر ان کے لیے اس کے اوپر گرم پانی کی ملونی ہوگی۔ پھر ان کا مرجع دوزخ کی طرف ہوگا۔ انھوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہی میں پایا۔ پھر یہ بھی انہی کے نقشِ قدم پر بھاگتے رہے۔ اور ان سے پہلے بھی اگلوں میں اکثر گمراہ ہوئے۔ اور ہم نے ان میں اپنے منذر بھیجے تو دیکھو، ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جن کو انذار کیا گیا۔ صرف ہمارے مخصوص بندے ہی اس انجام سے محفوظ رہے۔ ۱۱-۷۴

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ط اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (۱۱)

امکانِ قیامت کی ایک واضح دلیل

احوالِ قیامت کے بیان کے لیے پہلے بطور تمہید اس کے امکان کے سوال کو لیا ہے کہ اگر یہ لوگ تمھارے انذارِ قیامت کو اس بنا پر جھٹلاتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا ان کے نزدیک مستبعد ہے تو ان سے پوچھو کہ یہ آسمان و زمین، یہ دریا اور پہاڑ، یہ سورج اور چاند جو خدا نے پیدا کیے ہیں ان کو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا آدمیوں کو؟ تو جو خدا یہ عظیم چیزیں عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہے وہ انسان جیسی حقیر چیز کو دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں عاجز رہے گا؟ یہی مضمون سورۂ مؤمن میں یوں بیان ہوا ہے۔ 'لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' (۵۷) (آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے زیادہ مشکل ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے) یہی سوال دوسرے مقام میں یوں اٹھایا ہے: 'ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا' (النّٰزعٰت: ۲۷) (کیا تمھارا پیدا کیا جانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا جس کو بنایا)۔

'اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ'۔ 'طین لازب' چپکنے والی مٹی کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو تو ہم نے چپکنے والی مٹی سے بنا ڈالا۔ ہمیں ان کے بنانے کے لیے کوئی خاص سروسامان فراہم نہیں کرنا پڑا تھا کہ دوبارہ اس کو فراہم کرنا ہمارے لیے مشکل ہو جائے۔ جس مٹی سے ہم نے ان کو بنایا اس کی بہت بڑی مقدار ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم جب چاہیں گے ان کو پھر بنا دیں گے۔ جب پہلی بار ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو دوبارہ ہمارے لیے یہ کام کیوں مشکل ہو جائے گا!

یہاں 'اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا' میں 'مَنْ' کے استعمال سے ذہن اس طرف بھی جاتا ہے کہ مقابلہ ملائکہ اور

جنات کی خلقت سے کیا جا رہا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان سے پوچھو کہ ان کو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا دوسری مخلوقات جو ہم نے پیدا کی ہیں (مثلاً جنات اور ملائکہ) ان کو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے۔ ان کو تو ہم نے مٹی سے پیدا کیا ہے اور ملائکہ اور جنوں کو تو نور اور نار سے پیدا کیا ہے تو اگر ہم ان کے پیدا کرنے پر قادر ہو گئے تو ان کو دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں قاصر رہ جائیں گے!

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ (۱۲)

متکلم اور مخاطب میں بُعد المشرقین

یعنی تمھارے لیے ان کا انکار تعجب انگیز ہے اور ان کے لیے تمھارا یہ دعویٰ وجہ تمسخر ہے۔ تم حیران ہو رہے ہو کہ بھلا کوئی عاقل ایسی واضح حقیقت کو کس طرح جھٹلا سکتا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ مذاق اڑا رہے ہیں کہ کوئی شخص عقل و ہوش رکھتے ہوئے اس طرح کی بات کس طرح کہہ سکتا ہے! مطلب یہ ہے کہ تمھارے اور ان کے درمیان بُعدُ المشرقین ہے اور تم ان کی اس دوری کا صحیح اندازہ نہیں کر رہے ہو اس وجہ سے ان کا رویہ تمھارے لیے وجہ پریشانی ہے۔

وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ (۱۳)

یہ اس بُعد ذہنی کا لازمی نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جب ان کے سوچنے کا انداز اتنا مختلف ہے کہ جو چیز تمھارے نزدیک بدیہی ہے وہ ان کے نزدیک ایک مذاق ہے تو تمھاری ساری تذکیر و تنبیہ ان کے لیے بالکل بے سود ہے۔ ان کو جو نصیحت بھی کی جاتی ہے وہ سب ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ کوئی دلیل بھی ان پر کارگر نہیں ہوتی۔

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۴-۱۵)

فرمایا کہ اس طرح کے لوگ کسی بڑے سے بڑے معجزہ سے بھی قائل نہیں ہوتے۔ زچ کرنے کے لیے اس کا مطالبہ تو کرتے ہیں لیکن جب کوئی نشانی ان کے سامنے آتی ہے تو اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے ہیں کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۱۶-۱۷)

یہ تعبیر ہے ان کے مذاق کی۔ فرمایا کہ وہ کہتے ہیں کہ بھلا جب ہم مر جائیں گے اور سڑ گل کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو اس کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے؟ اور تعجب پر تعجب ان کو یہ ہے کہ کیا ان کے آباء و اجداد بھی اٹھائے جائیں گے! یہ باتیں ان کو عقل سے بالکل بعید معلوم ہوتی ہیں اس وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ اس چیز سے ان کو ڈراتے ہیں وہ دیوانے ہیں۔

قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ (۱۸)

چونکہ ان کا سوال بانداز مذاق ہے اس وجہ سے اس کا جواب بھی نہایت تیکھے انداز میں دیا ہے۔ فرمایا کہ جی ہاں، آپ لوگ اٹھائے بھی جاؤ گے اور اس وقت نہایت ذلیل بھی ہو گے!

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ (۱۹)

ظہور قیامت کے وقت منکرین کی حواس باختگی

یعنی یہ لوگ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو کوئی خاص اہتمام و انتظام کرنا پڑے گا۔ یہ کام صرف ایک ڈانٹ میں انجام پا جائے گا۔ ایک ہی ڈانٹ میں وہ دفعتہ اٹھ کر تاکنے لگیں گے۔ سورۂ نازعات میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: 'فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ' (۱۳-۱۴) (بس وہ ایک ہی ڈانٹ ہوگی کہ وہ دفعتہ بیداری کی حالت میں آ جائیں گے)۔ اس اسلوبِ بیان میں سراسیمگی اور دہشت زدگی کا جو مضمون ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ (۲۰)

یعنی جس قیامت کا آج اس رعونت کے ساتھ انکار کر رہے ہیں اس وقت پکار اٹھیں گے کہ ہائے ہماری شامت! یہ تو وہی جزا و سزا کا دن آ گیا جس کو ہم جھٹلاتے رہے تھے۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۲۱)

ان کی اس بات پر فرشتے کہیں گے کہ جی ہاں! یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم لوگ جھٹلاتے رہے تھے!

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ (۲۲-۲۳)

'اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' سے مراد مشرکین ہیں۔ اس لیے کہ سب سے بڑا ظلم شرک ہی ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اشارہ خاص طور پر ائمۂ شرک کی طرف ہے۔

لفظ 'اَزْوَاج' یہاں ہم مشربوں، اتباع اور پیروکاروں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

'مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ' سے مراد ان کے شرکائے جن اور وہ اصنام و احجار ہیں جن کی وہ پرستش کرتے رہے تھے۔

قیامت کے دن ان سب کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ہوگا کہ ان سب کو اکٹھا کر کے ان کو جہنم کا رستہ دکھاؤ۔

وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ۝ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ (۲۴-۲۶)

یہ اس دن ان کی ذلت اور بے بسی کی تصویر ہے۔

منکرین کی ذلت و بے بسی

ارشاد ہوگا کہ اچھا، ذرا دیر کے لیے ان کو روکو، ان سے ایک بات تو پوچھ لی جائے۔ 'مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ' یہ وہ بات ہے جس کو پوچھنے کے لیے ان کو روکا جائے گا۔ ارشاد ہوگا کیا وجہ ہے، آج تم لوگ ایک دوسرے کی مدد نہیں کر رہے ہو؟ دنیا میں تو تم ایک دوسرے کے جھنڈے اٹھائے پھرے لیکن آج نہ لیڈر پیروؤں کی کوئی مدد کر رہے ہیں اور نہ پیرو لیڈروں کی، نہ معبود عابدوں کے

لیے کچھ کرتے نظر آ رہے ہیں اور نہ عابد معبودوں کے لیے کسی جوشِ فدویت کا اظہار کر رہے ہیں۔ آخر ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت کیوں طاری ہے! ایک دوسرے کے لیے اصلی جاں نثاری کا وقت تو اب آیا ہے لیکن اس وقت تو ہر ایک کو صرف اپنی پڑی ہوئی ہے!!

'بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ'۔ 'استسلام' کے معنی حوالے کر دینے اور مطیع بن جانے کے ہیں۔ فرمایا کہ آج تو یہ لوگ بڑے ہی مطیع و نیاز مند بنے ہوئے ہیں! کل تک تو ان کی رعونت کا یہ عالم تھا کہ پیٹھ پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے تھے لیکن آج سب نے ہتھیار ڈال دیے ہیں!

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (۲۷)

لیڈروں اور پیروؤں کی تو تکار

'تساءل' یہاں باہم سوال و جواب کے مفہوم میں ہے اور آگے تفصیل آ رہی ہے اس تو تکار کی جو اس دن لیڈروں اور اس کے پیروؤں میں ہو گی۔

قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ۔ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۲۸-۲۹)

قرینہ دلیل ہے کہ پہلے 'قَالُوْا' کے فاعل عوام ہیں اور دوسرے کے ان کے لیڈر۔ یعنی اس دن عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ یہ آپ ہی لوگوں کی لائی ہوئی شامت ہے۔ آپ ہی لوگ دہنے اور بائیں سے ہر وقت ہم کو گھیرے رہتے تھے کہ ہم پیغمبر کی بات نہ سنیں۔ اگر آپ لوگ ہماری راہ میں اڑنگے نہ ڈالتے تو ہم ضرور ایمان لانے والے بنتے۔ لیڈر ان کی بات کاٹ کر فوراً ان کو جواب دیں گے کہ تمھارا یہ الزام بالکل جھوٹ ہے۔ تم لوگ خود ہی ایمان لانے والے نہیں تھے۔

وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ (۳۰)

'سُلطان' کے معنی زور اور اختیار کے ہیں۔ یعنی ہمارا تمھارے دلوں پر کوئی زور و اختیار تو تھا نہیں کہ تم اپنا قصور ہمارے سر تھوپتے ہو۔ تم خود نافرمان اور سرکش لوگ تھے کہ حق کے واضح طور پر سامنے آ جانے کے بعد تم نے اس کی پیروی کرنے کے بجائے ہماری بات مانی۔

ایک نادر اسلوب

'تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ' کے ٹکڑے کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑی الجھن پیش آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات اسلوبِ کلام کی اس ندرت کو نہیں سمجھ سکے جو یہاں ملحوظ ہے۔ قرآن میں اہلِ دوزخ کے باہمی سوال و جواب کے سلسلے میں یہ بلیغ اسلوب جگہ جگہ استعمال ہوا ہے کہ متکلم کی بات شروع ہوتے ہی مخاطب اس کو کاٹ کر اس کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اس کے لگائے ہوئے الزام سے اپنے کو بچا لے جائے۔ پچھلی سورتوں میں اس کی بعض مثالوں کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ آگے بھی، خاص طور پر آخری گروپ کی سورتوں میں، اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔

یہاں بھی وہی اسلوب ہے۔ عوام جونہی اپنے لیڈروں کو ملامت کرنا چاہیں گے اور ان کی زبان سے یہ کلمہ نکلے گا کہ آپ ہی لوگ ہمارے پاس آتے تھے دہنے سے ......" تو ان کے لیڈر سمجھ جائیں گے

کہ یہ لوگ کہنا چاہتے ہیں کہ تم ہی لوگ ہمارے دہنے بائیں سے آ آکر ہمیں پیغمبر کی بات سننے سے روکتے رہے ہو چنانچہ جونہی ان کی زبان سے لفظ 'عَنِ الْيَمِينِ' نکلے گا وہ فوراً سبقت کر کے ان کی بات کاٹ دیں گے اور اپنا دفاع شروع کر دیں گے۔ ان کی اس مداخلت اور اس قطع کلام کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن نے بات 'عَنِ الْيَمِينِ' ہی پر ختم کر دی ہے تاکہ اسلوب کلام ہی سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ آج جو لوگ آنکھ بند کر کے اپنے لیڈروں کی پیروی کر رہے ہیں ایک دن آئے گا کہ ان کے لیڈر ان کو بات بھی پوری نہیں کہنے دیں گے بلکہ بیچ ہی سے بات کاٹ کر اپنی براءت کا اعلان شروع کر دیں گے۔ سورۂ سبا کی آیات ۳۱-۳۳ کے تحت لیڈروں اور عوام کی تو تکار کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا إِنَّا لَذَائِقُونَ ۝ فَأَغْوَيْنَاكُمْ إِنَّا كُنَّا غَاوِينَ (۳۱-۳۲)

یہ بھی لیڈروں ہی کی بات نقل ہوئی ہے کہ اب ایک دوسرے پر الزام تھوپنے سے کچھ حاصل نہیں۔ مجرم ہم بھی ہیں اور تم بھی ہو اس وجہ سے خدا کی وہ بات جو اس نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں فرمائی تھی کہ 'میں تجھ کو اور تیری پیروی کرنے والوں کو جہنم میں بھر دوں گا' ہم دونوں پر پوری ہو چکی ہے۔ اب ہم کو لازماً وہ عذاب چکھنا ہے جو ہمارے جیسے شامت زدوں کے لیے مقدر ہے۔ 'فَأَغْوَيْنَاكُمْ إِنَّا كُنَّا غَاوِينَ' یعنی ہم سزاوارِ ملامت اس صورت میں ہوتے جب ہم خود نیک ہوتے اور تم کو بد بنانے کی کوشش کرتے۔ ہم جو کچھ خود تھے وہی ہم نے تم کو بنانے کی کوشش کی۔ یہ تمھاری بے بصیرتی تھی کہ تم نے ہماری پیروی کی اور اس سے بڑی بے بصیرتی یہ ہے کہ ہماری پیروی کا جو انجام سامنے آیا ہے اس کے لیے موردِ الزام ہم کو ٹھہراتے ہو! آخر اندرائن سے تم نے سیب کھانے کی توقع کیوں کی؟

فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ (۳۳)

لیڈر اور پیرو دونوں جہنم میں

مطلب یہ ہے کہ اس دن عوام کا یہ عذر کچھ کام نہیں آئے گا کہ ان کی گمراہی کے ذمہ دار دوسرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو اتنی عقل دی ہے کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کر سکے، بالخصوص جب کہ باطل کے مقابلے میں حق کی دعوت دینے والے بھی موجود ہوں۔ اس وجہ سے ایسے عوام اور ایسے لیڈر دونوں عذاب میں حصہ دار ہوں گے۔

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ۝ إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَجْنُونٍ (۳۴-۳۶)

مجرمینِ قریش کا انجام

آخرت میں پیش آنے والا ماجرا سن کر اب یہ کلام کو مطابقِ حال کر دیا کہ یہ صرف دوسروں ہی کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ تمام مجرموں کے ساتھ ہوگا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ جب ان کو دعوت دی جاتی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو وہ غرور سے اکڑتے اور کہتے کہ بھلا ہم ایک خبطی شاعر کے

کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں! تو جب یہی بات آج کے لوگ اپنے رسول کو کہتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ یہی صورت ان کو پیش نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو تمام مجرموں کے ساتھ ایک ہی ہو گا۔

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷)

قریش کو جواب

یہ قریش کو جواب دیا گیا ہے کہ جو شخص تمھیں توحید کی دعوت دے رہا اور خدا کے عذاب سے ڈرا رہا ہے یہ کوئی دیوانہ یا شاعر نہیں ہے بلکہ وہ تم کو ایک امر شدنی کی خبر دے رہا ہے۔ اس کے رسول برحق ہونے کی نہایت واضح دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح تک تمام رسولوں نے اس کی پیشین گوئی کی اور اس کی بعثت سے ان کی پیشین گوئیوں اور ان کی تعلیمات کی تصدیق ہوئی ہے۔ یہ شخص تمھارے اندر کوئی اجنبی ہے اور نہ اس کی تعلیمات تمھارے لیے انوکھی ہیں۔ اس کی خبر پچھلے رسولوں نے دی ہے اور اس کی تعلیمات کی تصدیق پچھلے صحیفوں سے ہو رہی ہے۔ اگر تم اس بات سے بے خبر ہو تو اہل کتاب سے پوچھو، ان میں جو ایمان دار ہوں گے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے ـــــ یہ ساری باتیں پچھلی سورتوں میں تفصیل سے زیر بحث آ چکی ہیں اس وجہ سے ہم یہاں اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ۚ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۸-۳۹)

یعنی اللہ کا رسول تمھیں جس عذاب کی خبر دے رہا ہے اس کو خبط و جنون پر محمول نہ کرو بلکہ وہ ایک حقیقت ہے۔ اگر تم نے اس کی تکذیب کر دی تو تمھیں لازماً اس دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور یہ تمھارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی بلکہ یہ ٹھیک ٹھیک تمھارے اعمال کا بدلہ ہو گا جو تمھارے سامنے آئے گا۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ (۴۰)

عذاب سے محفوظ رہنے والے

استثناء یہاں منقطع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس انجام سے ہر ایک کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اللہ کے وہی بندے اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ نے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیا ہو۔ یہ بات ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کے لیے انہی بندوں کو خاص کرتا ہے جو اپنے ایمان و عمل سے اس کا استحقاق پیدا کرتے ہیں۔ لفظ 'مخلص' صرف اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے کہ جس کو جو کچھ بھی ملے گا خدا ہی کے فضل و رحمت سے ملے گا، کسی دوسرے کے امکان میں یہ نہیں ہے کہ وہ کسی کو کچھ دے دلا سکے، جیسا کہ مشرکین نے گمان کر رکھا ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ (۴۱)

'رزق معلوم' کا مفہوم

فرمایا کہ بے شک یہ لوگ ہیں جن کے لیے خدا کے ہاں معلوم و متعارف رزق ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے کھانے پینے کے اوقات کا پروگرام بھی ان کے منشا کے مطابق معین ہو گا اور جو چیزیں ان کے سامنے پیش کی جانے والی ہوں گی وہ بھی ان کی پسند اور ان کے انتخاب کے موافق ہوں گی۔ دوزخیوں کا حال

تو یہ ہوگا کہ دوزخ کے داروغے ان کے آگے، جب ان کے جی میں آئے گا، کچھ پھینک ماریں گے اور جو چیزیں بھی پھینکیں گے وہ بالکل اجنبی اور ایک سے ایک بڑھ کر بُری ہوں گی لیکن اہلِ جنت کے سامنے جو چیزیں بھی پیش کی جائیں گی ان کی طلب، ان کی پسند اور ان کے پروگرام کے مطابق پیش کی جائیں گی۔ وہ چیزیں ان کے لیے انجان نہیں ہوں گی کہ ان کو دیکھ کر انقباض یا وحشت ہو بلکہ ہر چیز جانی پہچانی ہوئی ہوگی البتہ معیار ہر چیز کا وہ ہوگا جو جنت اور اہلِ جنت کے لیے خاص ہوگا۔ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (البقرۃ: ۲۵) (جب جب ان کے سامنے اس جنت کے پھلوں میں سے کچھ پیش کیا جائے گا وہ کہیں گے یہ تو وہی چیز ہمارے سامنے لائی گئی جو پہلے دی گئی اور وہ اس سے ملتی جلتی چیز دیے جائیں گے) اس آیت کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس مقام کو سمجھنے کے لیے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ۙ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۙ عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ (۴۲-۴۴)

یعنی ان کے سامنے میوے پیش کیے جائیں گے اور ان کے ساتھ نہایت اعزاز و اکرام کا معاملہ ہوگا۔ اہلِ دوزخ کے متعلق تو آیت ۱۸ میں گزر چکا ہے کہ نہایت ذلت کے ساتھ وہ دوزخ کے باڑے میں بھر دیے جائیں گے اور آگے آیات ۶۲-۶۷ میں آ رہا ہے کہ زقوم ان کو کھانے کے لیے اور کھولتا پانی پینے کو دیا جائے گا۔ اس کے برعکس اہلِ جنت کو کھانے کے لیے میوے ملیں گے اور ان کے ساتھ نہایت عزت کا سلوک ہوگا۔

'فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ' سے ان کے مستقل مستقر کا پتہ دے دیا کہ وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے اس وجہ سے ان کو تمام نعمتیں بھی جو وہ چاہیں گے اور جتنی چاہیں گے، حاصل ہوں گی۔

اہلِ جنت کی باہمی محبت و خوش دلی

'عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ' سے ان کی باہمی محبت و خوش دلی کا اظہار ہو رہا ہے کہ وہ تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ امر واضح رہے کہ جب دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف رنجش و کدورت ہو تو آدمی ایک دوسرے سے منہ پھیر کر بیٹھتا ہے۔ اہلِ جنت کے دل چونکہ ایک دوسرے سے بالکل صاف ہوں گے اس وجہ سے ایک دوسرے کی طرف رُخ کر کے بیٹھیں گے۔ اُوپر اہلِ دوزخ کی باہمی تو تکار کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس کے مقابل میں یہ اہلِ جنت کی تصویر پیش کی جا رہی ہے۔

یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ ۙ بَیْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۚۖ لَا فِیْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا یُنْزَفُوْنَ (۴۵-۴۷)

اہلِ جنت کی شراب

'كَاْس' عربی میں ظرف اور مظروف یعنی پیالہ اور شراب دونوں کے لیے آتا ہے۔ 'مَعِیْن' خالص اور بے آمیز کو کہتے ہیں۔ سورۂ ملک آیت ۳۰ میں اس معنی کے لیے نظیر موجود ہے۔ 'غَوْل' خفیہ طور پر ہلاک کرنے کے معنی میں آتا ہے اور یہیں سے یہ کسی مخفی ضرر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ 'یُنْزَفُوْنَ'

نڈھال ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے اور تعطّلِ عقل کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ دونوں معنی بنتے ہیں۔ شراب کا ردِ عمل خمار، اعضاء شکنی اور شدید اضمحلال کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور تعطّلِ عقل کی صورت میں بھی، پہلی صورت جسمانی اذیت کی ہے اور دوسری صورت اخلاقی فساد کی۔ اہلِ جنت کی شراب ان دونوں آفتوں سے پاک ہوگی۔ آیات کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے لیے شراب خالص کے جام گردش میں ہوں گے۔ یہ شراب ہر غل و غش سے پاک، نہایت صاف شفاف اور پینے والوں کے لیے سراپا لذت و سرور ہوگی، اس میں نہ تو کوئی مخفی ضرر ہوگا اور نہ اس کے پینے سے عقل معطل ہوگی ـــــ یعنی اس میں وہ خوبیاں تو تمام ہوں گی جو اعلیٰ سے اعلیٰ شراب میں ہونی چاہئیں اور ساتھ ہی وہ ہر اس خرابی سے پاک ہوگی جو اس دنیا کی بہتر سے بہتر شراب میں بھی لازماً ہوتی ہیں۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۝ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ (۴۸ - ۴۹)

اہلِ جنت کی حوریں

انسان کی کوئی لذت و خوشی بھی عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اس وجہ سے جنت کی نعمتوں کے بعد یہ ان حوروں کا ذکر ہوا جو اہلِ جنت کو ملیں گی۔ جنت کے ذکر میں آپ نے دیکھا کہ عربوں کے خاص ذوق کا لحاظ ہے اس لیے کہ وہی قرآن کے مخاطبِ اوّل تھے اسی طرح حوروں کے ذکر میں بھی تشبیہ و تعریف کے وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو شعرائے عرب کنواریوں اور نازنینوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ 'قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ' کے اصل معنی ہیں نگاہیں نیچی رکھنے والیاں۔ یہ ان کے باحیا ہونے کی تعبیر ہے۔ اہلِ عرب عورت کا سب سے بڑا حسن اس کی حیا کو قرار دیتے تھے۔ 'عِيْنٌ' جمع ہے 'اعین' کی یعنی وہ بڑی آنکھوں والیاں غزال چشم ہوں گی۔

'كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ'۔ 'بیض مکنون' سے شتر مرغ کے انڈے مراد ہیں۔ کلامِ عرب میں نازنینوں کی تشبیہ شتر مرغ کے انڈوں سے بکثرت ملتی ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس تشبیہ میں عفت، صیانت اور رنگ تینوں چیزوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ 'مکنون' سے ان کے اچھوتے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جس طرح اہلِ عرب کنواریوں کی حفاظت میں بڑے غیور رہا کرتے تھے اسی طرح شتر مرغ بھی اپنے انڈوں کی حفاظت میں جان لڑا دیتا ہے۔ تشبیہ میں یہاں سنہرے رنگ کے انڈے مراد ہیں۔ نازنینوں کے سنہرے رنگ کا شعرائے عرب بہت ذکر کرتے ہیں۔ 'معشوقہ' کے لیے 'صفرار' کی صفت ان کے ہاں بہت معروف ہے۔ میں ان تمام باتوں کی تائید میں کلامِ عرب کے حوالے پیش کر سکتا ہوں لیکن غیر ضروری طوالت سے بچنا چاہتا ہوں۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (۵۰)

اہلِ جنت کا ایک مکالمہ

اب آگے آیت ۶۱ تک اہلِ جنت کے ایک باہمی مکالمے کا حوالہ ہے جو اس وقت ان کے مابین ہوگا جب وہ تختوں پر ٹیک لگائے جنت میں بیٹھے ہوں گے۔ اس دنیا میں حق کی خاطر مزاحمتوں کا

مقابلہ کرنے میں انھوں نے جو کامیابیاں حاصل کی ہوں گی ان پر ان کو جو خوشی ہوگی اس کا بھی اس مکالمہ سے اندازہ ہوتا ہے اور اس بے خودی کا بھی جو اس تصور سے ان پر طاری ہوگی کہ اب موت، اور عذاب کے اندیشوں سے ان کو ہمیشہ کے لیے رہائی حاصل ہو گئی۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ اِنِّىۡ كَانَ لِىۡ قَرِيۡنٌۙ ۝ يَّقُوۡلُ اَءِنَّكَ لَمِنَ الۡمُصَدِّقِيۡنَ ۝ ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيۡنُوۡنَ ۝ قَالَ هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّطَّلِعُوۡنَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِىۡ سَوَآءِ الۡجَحِيۡمِ ۝ قَالَ تَاللّٰهِ اِنۡ كِدْتَّ لَـتُرۡدِيۡنِۙ ۝ وَلَوۡلَا نِعۡمَةُ رَبِّىۡ لَـكُنۡتُ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ ۝ اَفَمَا نَحۡنُ بِمَيِّتِيۡنَۙ ۝ اِلَّا مَوۡتَتَنَا الۡاُوۡلٰى وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ ۝ (۵۱ - ۵۹)

اصحابِ جنت میں سے ایک صاحب اپنے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے ساتھیوں کو اپنے ماضی کی ایک سرگزشت سنائیں گے کہ میرا ایک ملنے والا تھا جو بڑے تعجب سے مجھ سے سوال کیا کرتا تھا کہ کیا تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جو قیامت کو مانتے ہیں! کیا تمھاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو اپنے اعمال کی جزا و سزا بھگتنے کے لیے دوبارہ اٹھائے جائیں گے!!

قَالَ هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّطَّلِعُوۡنَ: اس کے بعد وہ ساتھیوں سے کہیں گے ذرا دیکھو تو سہی اس کا کیا بنا! یہ اسلوبِ کلام، عربی میں کسی کو کسی کام پر ابھارنے کے لیے آتا ہے جس طرح ہم کہتے ہیں 'ذرا معلوم تو کرو بھلا! ذرا جھانک کے دیکھو تو سہی!' مطلب یہ کہ جس جزا کے دن کو وہ اتنا مستبعد سمجھتا تھا کہ اس کے خلاف روز مجھ سے لڑتا تھا وہ دن تو آ گیا، اب ذرا اس کا پتہ کرو کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے!

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِىۡ سَوَآءِ الۡجَحِيۡمِ: یہ کہتے ہوئے وہ خود ہی جھانک کے دیکھیں گے۔ تو وہ ان کو جہنم کے بیچ میں نظر آئے گا۔ 'سَوَآءِ' کے معنی وسط کے ہیں ——— اس سے اہل جنت کی قوتوں اور صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تخت پر بیٹھے بیٹھے جس شخص کو چاہیں گے دیکھ لیں گے اگرچہ وہ کتنا ہی دور ہو اور اس سے بات بھی کر لیں گے۔

قَالَ تَاللّٰهِ ..... لَـكُنۡتُ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ: اس کے بعد وہ اس کو لتاڑیں گے کہ ظالم تو مجھے بھی لے ڈوبا تھا! یہ تو اللہ کا فضل ہوا کہ تمھارے فریب سے میں محفوظ رہا۔ ورنہ آج جس طرح تم اس عذاب میں گرفتار ہو اسی طرح میں بھی گرفتار ہوتا!

اَفَمَا نَحۡنُ بِمَيِّتِيۡنَ ..... وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ: اس کا یہ انجام اور اپنی یہ کامیابی دیکھ کر گویا وہ خوشی سے اچھل پڑیں گے اور اپنے ساتھیوں سے کہیں گے، کیا یہ واقعہ ہے کہ اب ہم موت کے پنجے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ اور عذاب کے اندیشہ سے ہمیشہ کے لیے نچنت ہو گئے!! مطلب یہ ہے کہ اگر یہ بازی ہم نے جیت لی تو سب سے بڑی بازی جیت لی۔ اسلوبِ کلام پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی کامیابی ان کی توقعات سے اتنی زیادہ ہوگی کہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی انھیں اپنے اوپر اعتبار نہیں ہوگا اور وہ اپنے ساتھیوں

سے اس کی تصدیق چاہیں گے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ (۶۰-۶۱)

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بات پر استدراک ہے کہ اصل کامیابی یہ ہے جو اللہ کے ان بندوں کو حاصل ہوگی جو آخرت کو پیشِ نظر رکھ کر زندگی گزاریں گے تو جس کو بازی کھیلنی ہو اس کے لیے بازی کھیلے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رات دن دنیا کے عشق ہی میں سرگرم ہیں اگر انھوں نے کوئی کامیابی حاصل بھی کرلی تو کتنے دنوں کے لیے، بالآخر تو مرنا اور ایک دن جزا و سزا کے لیے خدا کے حضور پیش ہونا ہے تو اس حیاتِ چند روزہ کی خاطر اپنی تمام مساعی برباد کرنے کے بجائے ابدی کامیابی کے لیے کمر ہمت کیوں نہ باندھیں!

اَذٰلِكَ خَیْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِیْنَ ۝ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْۤ اَصْلِ الْجَحِیْمِ ۝ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ ۝ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَیْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِیْمٍ (۶۲-۶۷)

اہلِ دوزخ کا حشر

اہلِ جنت کے بعد اب یہ اہلِ دوزخ کی ضیافت کا بیان ہے۔ اس کا آغاز اس سوال سے کیا ہے کہ اہلِ جنت کو جو کچھ حاصل ہوگا اس کا ذکر تو سن چکے اب یہ بتاؤ کہ یہ ضیافت بہتر ہے یا زقوم والی ضیافت جس سے اہلِ دوزخ کو سابقہ پیش آنا ہے!

اِنَّا جَعَلْنٰهَا الاٰیۃ: فرمایا کہ اس درخت کو ان ظالموں کے لیے ہم نے ایک فتنہ بنایا ہے جس کی آڑ لے کر انھوں نے دوزخ کا خوب خوب مذاق اڑایا ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جب ان کو قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ دوزخ میں ان کو کھانے کو زقوم ملے گا تو انھوں نے اس سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے اس پر فقرے چست کیے کہ خوب ہے یہ دوزخ کہ اس میں آگ بھی ہوگی، درخت بھی ہوں گے اور پانی بھی! فرمایا کہ یہ درخت ان کے لیے فتنہ بن گیا اور اس کے پردے میں انھوں نے ایک ایسی حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کی جس سے بہرحال انھیں سابقہ پیش آنا ہے۔

اِنَّهَا شَجَرَةٌ ۔الاٰیۃ: فرمایا کہ ان کو تعجب ہے کہ آگ میں درخت کس طرح ہوگا! اور اس درخت کی فطرت یہ ہے کہ اس کے اُگنے کا اصلی علاقہ قعرِ دوزخ ہی ہے یہ اسی میں پھلتا پھولتا ہے۔

ایک بلیغ تشبیہ

طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ: یہ تشبیہ نہایت بلیغ ہے۔ بعض مرتبہ تشبیہ کسی خیالی چیز سے دی جاتی ہے لیکن وہ مرئی و شاہد چیزوں سے زیادہ ذہنوں سے قریب ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کسی پراگندہ حال و پراگندہ بال شخص کو کہیں کہ کیا بھوت کی سی شکل بنا رکھی ہے! بھوت اگرچہ ایک خیالی چیز ہے لیکن اس کا ایک تصور ہر شخص کے ذہن میں موجود ہے اس وجہ سے یہ تشبیہ اس شخص کو جس خوبی کے ساتھ مصوّر کرے گی کوئی دوسری تشبیہ مشکل ہی سے کر سکے گی۔ اسی طرح یہاں دوزخ کے زقوم کے پتوں اور کانٹوں کو شیاطین کے سروں سے تشبیہ دی ہے، گویا بہت سے شیاطین ننگے سر کھڑے ہوں۔ ہر چند یہ تشبیہ ہے

خیالی لیکن ذہنوں میں شیاطین کا ایک خوفناک تصور موجود ہے اس وجہ سے اس کو سن کر دل پر ایک کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

'فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ ...... مِنْ حَمِيْمٍ' فرمایا کہ یہ زقوم ان کی غذا بنے گا اور یہ اس کے کھانے پر اس طرح مضطر ہوں گے کہ اسی سے اپنے پیٹ بھریں گے۔ اور پھر اس کو حلق سے اتارنے اور ہضم کرنے کے لیے اس کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی پئیں گے۔

ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ (۶۸)

یہ زقوم اہلِ دوزخ کو بطور 'نُزُل' کے ملے گا جیسا کہ آیت ۶۲ میں تصریح ہے۔ 'نُزُل' اس چیز کو کہتے ہیں جو اوّلین ضیافت کے طور پر مہمان کے سامنے پیش کی جائے۔ فرمایا کہ ان کی اوّلین ضیافت تو اس زقوم اور کھولتے پانی سے ہوگی۔ پھر اس کے بعد ان کا اصل ٹھکانا جہنم بنے گی جہاں ان کے سارے اعمال کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے۔

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ۝ فَهُمْ عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ (۶۹-۷۰)

گمراہی کی اصل علت

یہ ان کی تمام گمراہی کی اصل علت کا پتہ دیا ہے کہ انھوں نے اپنی عقل و بصیرت سے کام نہیں لیا بلکہ آنکھیں بند کر کے اپنے باپ دادا کے طریقہ کی پیروی کی۔ ان کے باپ دادا گمراہ تھے، انہی کی گمراہی انھوں نے اختیار کر لی اور جب اللہ کے رسولوں نے ان کو عقل سے کام لینے اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے نہایت غرور سے یہ کہہ کے ان کی دعوت رد کر دی کہ بھلا ایک خبطی شاعر کے کہنے سے ہم اپنے ان معبودوں کو چھوڑ دیں گے جن کی پوجا ہمارے باپ دادا کرتے آئے! ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ اندھی تقلید گمراہی کے سب سے بڑے عوامل میں سے ہے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ انسان کی عقل اور اس کے ارادہ کا امتحان کر رہا ہے اس وجہ سے جو شخص اپنی عقل اور اپنے ارادے کو معطل رکھے گا وہ خدا کے امتحان میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ (۷۱-۷۴)

'قَبْلَهُمْ' میں ضمیر کا مرجع قریش ہیں۔ اب یہاں سے کلام کا رخ تاریخی دلائل کی طرف مڑ رہا ہے۔ فرمایا کہ جس طرح کی گمراہی میں یہ (قریش) مبتلا ہیں اسی طرح کی گمراہی میں ان سے پہلے اکثر قومیں مبتلا ہو کر کیفرِ کردار کو پہنچ چکی ہیں۔ یہ اشارہ ان قوموں کی طرف ہے جن کا ذکر تفصیل سے پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے اور وہ اس سورہ میں بھی آگے آرہا ہے۔ فرمایا کہ ان کی اصلاح کے لیے ہم نے ان کے اندر اپنے 'مُنذر' بھیجے کہ وہ ان کی غلط روش کے انجام سے ان کو آگاہ کر دیں لیکن انھوں نے انہی کی طرح باپ دادا کی تقلید

کے جنون میں ان منذروں کی بات رد کر دی بالآخر ان کے سامنے وہی انجام آیا جو انذار کے بعد لازماً ہر قوم کے سامنے آتا ہے۔ صرف اللہ کے وہی بندے اس سے محفوظ رہے جن کو اللہ نے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیا ــــ مطلب یہ ہے کہ یہی کچھ ان کے سامنے بھی آنے والا ہے تو تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ اور ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۷۵-۱۴۸

آگے اختصار کے ساتھ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت الیاس، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں اور ہر سرگزشت کے آخر میں اس مضمون کی ترجیع ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو رحمت و سلامتی سے نوازا، اس کی دعوت کو فروغ بخشا اور اپنے خوب کار بندوں کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ اسی طرح صلہ دیتا ہے۔ یہی ترجیع درحقیقت ان سرگزشتوں کا لب لباب ہے۔

پیغمبروں کے ذکر میں ترتیب حضرت ہارون علیہ السلام تک تو تاریخی ہے اس کے بعد ترتیب صفاتی ہو گئی ہے۔ اس کی وضاحت آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۵-۱۴۸

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿۸۳﴾ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِى النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّىْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًاۢ بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ

وقف لازم

مَا تَنْحِتُونَ ﴿۹۵﴾ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾ قَالُوا ابْنُوا لَهُ
بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿۹۷﴾ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ
الْأَسْفَلِينَ ﴿۹۸﴾ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿۹۹﴾ رَبِّ هَبْ لِي
مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ
قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ
قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ﴿۱۰۲﴾
فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ﴿۱۰۳﴾ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ
صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۰۵﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ
الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿۱۰۶﴾ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴿۱۰۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي
الْآخِرِينَ ﴿۱۰۸﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿۱۰۹﴾ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۱۰﴾
إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۱﴾ وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِنَ
الصَّالِحِينَ ﴿۱۱۲﴾ وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ ۚ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَ
ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ مُبِينٌ ﴿۱۱۳﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿۱۱۴﴾ وَ
نَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ﴿۱۱۵﴾ وَنَصَرْنَاهُمْ فَكَانُوا هُمُ
الْغَالِبِينَ ﴿۱۱۶﴾ وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ﴿۱۱۷﴾ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ
الْمُسْتَقِيمَ ﴿۱۱۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِينَ ﴿۱۱۹﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿۱۲۰﴾
إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۲۱﴾ إِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۲﴾
وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۲۳﴾ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۲۴﴾
أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ﴿۱۲۵﴾ اللَّهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ

ع

اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾
اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَ
اِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا
عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ
عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ ع ۴ ۵ ۸
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ
الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ
مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ النصف
بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَ
اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ
اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾

ترجمہ آیات ۷۵-۱۴۸

اور نوح نے ہم سے فریاد کی پس کیا ہی خوب ہیں ہم فریاد سننے والے! اور ہم نے
اس کو اور اس کے لوگوں کو بہت بڑی کلفت سے نجات دی اور ہم نے اس کی ذرّیّت
ہی کو باقی رہنے والا بنایا اور ہم نے اس کے طریقہ پر پچھلوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ نوح پر
سلامتی ہے دنیا والوں میں! ہم خوب کاروں کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک وہ ہمارے
باایمان بندوں میں سے تھا۔ پھر ہم نے اوروں کو غرق کر دیا۔ ۷۵-۸۲

اور اسی کی جماعت میں سے ابراہیم بھی تھا۔ جب کہ وہ حاضر ہوا اپنے رب کے حضور میں

قلبِ سلیم کے ساتھ۔ جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بھلا تم لوگ کس چیز کو پوجتے ہو! کیا اللہ کے سوا دوسرے من گھڑت معبودوں کے طالب ہو! تو خداوندِ عالم کے باب میں تمھارا کیا گمان ہے! پس اس نے ایک نظر ستاروں پر ڈالی۔ پس کہا، میں تو ماندہ ہو رہا ہوں۔ پس وہ لوگ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ پس وہ نظر بچا کے ان کے دیوتاؤں کی طرف گیا۔ بولا، آپ لوگ نوش نہیں کرتے! کیا بات ہے کچھ بولتے نہیں! پھر مارا ان کو بھر پور ہاتھ۔ پس لوگ آئے اس کی طرف بھاگے ہوئے۔ اس نے کہا، کیا تم لوگ اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو! اللہ ہی نے پیدا کیا ہے تم کو بھی اور ان چیزوں کو بھی جن کو تم بناتے ہو۔ انھوں نے کہا، اس کے لیے ایک مکان بناؤ پس اس کو آگ میں جھونک دو۔ پس انھوں نے اس کے ساتھ چال کرنی چاہی تو ہم نے انھی کو نیچا دکھایا۔ اور اس نے کہا، میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔ اے میرے رب، مجھے اولادِ صالح عطا فرما۔ تو ہم نے اس کو ایک بُردبار فرزند کی بشارت دی۔ ۸۳ - ۱۰۱

پس جب وہ اس کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچا اس نے کہا، اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ تو غور کر لو تمھاری کیا رائے ہے! اس نے جواب دیا کہ اے میرے باپ، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی تعمیل کیجیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے ثابت قدموں میں پائیں گے۔ پس جب دونوں نے اپنے تئیں اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ابراہیم نے اس کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا اور ہم نے اس کو آواز دی، اے ابراہیم بس تم نے خواب کو سچ کر دکھایا! بے شک ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ بےشک یہ کھلا ہوا امتحان تھا اور ہم نے اس کو ایک عظیم قربانی کے عوض چھڑا لیا۔ اور ہم نے اس کی ملت

پر پچھلوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ سلامتی ہو ابراہیم پر! اسی طرح ہم خوب کاروں کو صلہ دیتے ہیں۔ بے شک وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے اس کو اسحاق کی خوشخبری دی، ایک نبی کی زمرۂ صالحین میں سے۔ اور ہم نے اس پر بھی اور اسحاق پر بھی برکتیں نازل کیں اور ان کی ذریت میں سے خوب کار بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلے ہوئے ظلم ڈھانے والے بھی۔ ۱۰۲ - ۱۱۳

اور ہم نے موسٰی اور ہارون پر اپنا فضل کیا۔ اور ان کو اور ان کی قوم کو ایک عظیم مصیبت سے نجات دی۔ اور ہم نے ان کی مدد کی تو وہی غالب آنے والے بنے۔ اور ہم نے ان کو روشن کتاب عطا فرمائی۔ اور ان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی۔ اور ہم نے ان کے طریقہ پر پیچھے والوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ سلامتی ہو موسٰی اور ہارون پر۔ ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک وہ دونوں ہمارے باایمان بندوں میں سے تھے۔ ۱۱۴ - ۱۲۲

اور الیاس بھی پیغمبروں میں سے تھا۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم لوگ ڈرتے نہیں! کیا تم لوگ بعل کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑتے ہو! —— اللہ کو جو تمہارا بھی خداوند ہے اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی! تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا تو بے شک وہ گرفتار ہونے والوں میں سے ہوں گے۔ اللہ کے خاص بندے محفوظ رہیں گے ور ہم نے اس کے طریقہ پر پچھلوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ اِلیاسیوں پر سلامتی ہو! ہم اسی طرح صلہ دیتے ہیں خوب کاروں کو۔ بے شک وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے تھا۔ ۱۲۳ - ۱۳۲

اور بے شک لوط بھی پیغمبروں میں سے تھا۔ جب کہ ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو، سب کو نجات دی بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے بنی۔ پھر ہم نے دوسروں

کو ہلاک کر دیا۔ اور تم ان کی بستیوں پر گزرتے ہو صبح کو بھی اور شب میں بھی، تو کیا تم سمجھتے نہیں! ۱۳۳-۱۳۸

اور بے شک یونس بھی پیغمبروں میں سے تھا۔ یاد کرو جب کہ وہ بھاگا ایک بھری کشتی کی طرف۔ پس قُرعہ ڈالا پس وہ دھکیلا گیا پس اس کو نگل لیا مچھلی نے اور وہ سزاوارِ ملامت تھا۔ پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک اس کے پیٹ ہی میں پڑا رہ جاتا۔ پس ہم نے ڈال دیا اس کو خشک زمین پر اور وہ نڈھال تھا اور اس پر ایک درخت بیل والا اُگا دیا۔ اور اس کو رسول بنا کر بھیجا ایک لاکھ بلکہ اس سے زیادہ کی طرف پس وہ لوگ ایمان لائے تو ہم نے ایک مدت تک ان کو کھانے بلسنے کی مہلت دی۔ ۱۳۹-۱۴۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ۝ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ (۷۵-۷۶)

حضرت نوحؑ کی فریاد اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی اس فریاد کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اپنے رب کے سامنے اس وقت کی ہے جب وہ ایک طویل مدت تک اپنی قوم کو دعوت دینے کے بعد اس کے ایمان سے کلیتہً مایوس ہو گئے ہیں اور جس کا ذکر سورۂ شعراء آیات ۱۱۷، ۱۱۸ میں گزر چکا ہے۔ سورۂ نوح میں ان کی یہ فریاد تفصیل سے نقل ہوئی ہے، جس کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (۲۶-۲۷)	اور نوح نے اپنے رب سے دعا کی، اے میرے رب! زمین پر تو کافروں میں سے کسی کو چلتا پھرتا نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو وہ صرف نابکاروں اور ناشکروں ہی کو جنم دیں گے۔

یہ فریاد حضرت نوح علیہ السلام نے اس وقت کی جب وہ اپنی طاقت کا آخری قطرہ بھی نچوڑ چکے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی فریاد فوراً سنی۔ چنانچہ ان لوگوں کے سوا جو حضرت نوحؑ پر ایمان لائے تھے بقیہ سارے لوگ غرق کر دیے گئے۔ سورۂ نوح میں ان کی قوم کے نابکاروں کا انجام ان الفاظ میں بیان ہوا ہے،

مِمَّا خَطِيْٓـٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا (نوح: ۲۵)

وہ اپنے جرائم کی پاداش میں غرق کر دیے گئے، پھر آگ میں داخل کیے گئے اور انھوں نے اللہ کے مقابل میں اپنے لیے کوئی مددگار نہیں پایا۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی دی گئی ہے کہ صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری دعاؤں اور جاں فشانیوں سے بے خبر نہیں ہے۔ جب قوم پر حجت تمام ہو جائے گی تو تم دیکھ لوگے کہ اللہ کی نصرت کس طرح ظاہر ہوتی ہے اور تمھارے دشمن کس طرح نامراد و پامال ہوتے ہیں۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ (۷۶-۷۷)

فرمایا کہ ہم نے نوحؑ اور اس کے ساتھیوں کو اس عظیم آفت سے محفوظ رکھا جس میں نوحؑ کی پوری قوم مبتلا ہوئی۔ 'اهل' سے مراد ان کے تمام باایمان اہل و عیال ہیں، اگرچہ اس لفظ کا اطلاق، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، کسی شخص کے اتباع پر بھی ہوتا ہے لیکن حضرت نوح علیہ السلام پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذریت ہی کے کچھ لوگ ایمان لائے اور وہی لوگ باقی رہنے والے بنے جن سے از سرِ نو یہ دنیا آباد ہوئی۔ باقی سارے لوگ اپنی سرکشی کی پاداش میں غرق کر دیے گئے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ (۷۸)

دعوت کے فروغ کی بشارت

اس ٹکڑے میں ایک مضاف اور 'تَرَكْنَا' کا مفعول عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق محذوف ہیں۔ یہ محذوفات کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ ہم نے اس کی ملت پر پچھلوں میں سے ایک گروہ کو قائم رکھا۔ یہ ان کی دعوت کی کامیابی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے دشمنوں کی تمام مخالفت کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت کو فروغ دیا، اخلاف میں ان کے حاملین پیدا ہوئے اور ان کے دشمن نیست و نابود ہوئے۔ اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری دعوت کو فروغ دے گا، آنے والی نسلوں میں یہ قائم و دائم رہے گی اور جو لوگ آج تمھاری مخالفت میں سرگرم ہیں ان کا کوئی نام لینے والا بھی باقی نہیں رہے گا۔

سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ (۷۹-۸۲)

یہ حضرت نوح علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین و آفرین اور دنیا و آخرت دونوں میں برکت و سلامتی کی بشارت ہے کہ اس دنیا میں جو مقام اس کو حاصل ہوا وہ اس سے پہلے کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ تمام خلق میں یہ بازی اسی نے جیتی۔

خوب کار بندوں کے لیے ابدی بشارت

'اِنَّا كَذٰلِكَ ...... الآیۃ' یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ یہ معاملہ صرف حضرت نوح علیہ السلام ہی

کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خوب کار بندوں کے ساتھ ہمیشہ یہی معاملہ کیا ہے اور آئندہ بھی وہ اپنے مخلص بندوں کے ساتھ یہی کرے گا۔ یہ فضیلت کسی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ صفات کے ساتھ مخصوص ہے۔ جو لوگ اپنے اندر احسان کی صفت پیدا کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو اسی طرح صلہ دے گا۔ لفظ احسان کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس کی اصل حقیقت پورے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری ہے۔

اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ: یہاں لفظ مومن اپنے کامل معنی میں ہے۔ یہ فقرہ بھی حضرت نوحؑ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین و آفرین کے مفہوم میں ہے کہ بے شک وہ ہمارے راسخ الایمان بندوں میں سے تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ اور اس کی دعوت لے کر اٹھتے ہیں ان کو اپنے سامنے یہ اسوہ رکھنا چاہیے۔ ایمان کا حقیقی تقتضا یہی ہے۔ جو لوگ اس طرح ایمان کا حق ادا کرتے ہیں وہی لوگ مرتبۂ احسان پر فائز ہوتے ہیں اور انہی کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ فضیلت ہے جو نوحؑ کو حاصل ہوئی۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ: یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو چھانٹ لیا جن کے اندر صلاحیت تھی، باقی سارے لوگوں کو غرق کر دیا۔ یہی اس دنیا کی خلقت کی غایت ہے۔ اس کے اندر سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو چھانٹ لے گا جو اپنے اندر صلاحیت کا ثبوت دیں گے۔ باقی سارے لوگوں کو خس و خاشاک کی طرح جہنم میں جھونک دے گا۔

وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرٰہِیْمَ (۸۳)

حضرت ابراہیمؑ اور ان کی دعوت

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر نبی و رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ان کی نسبت فرمایا کہ یہ بھی انہی کے زمرہ اور گروہ میں سے ہیں۔ جو دعوت خلق کو انھوں نے دی وہی دعوت انھوں نے بھی دی اور راہِ اللہ کی راہ میں جس ایمان و احسان کا مظاہرہ انھوں نے کیا اسی صدق و اخلاص کا مظاہرہ انھوں نے بھی کیا۔ اوپر آیت ۷۸ میں یہ بات جو فرمائی ہے کہ نوحؑ کی ملت پر ہم نے پچھلوں میں سے ایک گروہ کو قائم رکھا یہ اسی کے تسلسل کی طرف اشارہ ہے کہ جس ملت کے داعی حضرت نوحؑ تھے اسی ملت کے داعی بن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اٹھے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ تمام انبیاء کی ملت اصلاً ایک ہی ہے اور وہ ہے ملتِ اسلام۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث اس کے محل میں گزر چکی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ تالمود سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تربیت حضرت نوح علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ اگرچہ اس روایت پر میں مطمئن نہیں ہوں لیکن اس کی صحت اگر باور کر لی جائے تو حضرت ابراہیمؑ کے حضرت نوحؑ کے زمرے میں سے ہونے کا ایک اور پہلو بھی نکل آتا ہے۔

اِذْ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (۸۴)

حضرت ابراہیم کی کامل حنیفیت

یہ تعبیر ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کامل حنیفیت، اللہ کی طرف ان کی پوری یکسوئی اور ان کے کمال صدق و اخلاص کی۔ 'قلب سلیم' سے مراد وہ دل ہے جو شرک و نفاق کے امراض سے بالکل محفوظ و پاک ہو۔ سورۂ شعراء میں ہے: يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۸۸-۸۹) (اس دن کو یاد رکھو جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد، صرف وہ لوگ فیروز مند ہوں گے جو خدا کے حضور میں قلب سلیم لے کر حاضر ہوں گے) یعنی نہ تو ان کے دلوں کے اندر شرک و نفاق کا کوئی روگ ہوگا اور نہ ان کی وفاداری منقسم ہوگی بلکہ ان کے دل ہر آلائش سے پاک ہوں گے اور ان کی محبت و اطاعت تمام تر اللہ واحد کے لیے ہوگی۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ۝ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ (۸۵-۸۶)

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حنیفیت اور ان کے کمال اخلاص و توحید کے بیان کے لیے ان کی اس دعوت کا حوالہ ہے جو انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو دی۔

'مَاذَا تَعْبُدُوْنَ' کے الفاظ تحقیر پر دلیل ہیں۔ یعنی انھوں نے ان کو ملامت فرمائی کہ بھلا یہ کیسی بے حقیقت چیزیں ہیں جن کو تم لوگ پوج رہے ہو!

'اِفْك' کے معنی جھوٹ اور بے حقیقت بات کے ہیں۔ یعنی کیا محض جھوٹ موٹ، اپنے جی سے گھڑ کر، خدا کے سوا تم دوسرے معبودوں کے طالب بنے ہو!

فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۷)

یہ جملہ الفاظ کے لحاظ سے جتنا مختصر ہے معانی کے اعتبار سے اتنا ہی وسیع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا کے سوا دوسرے معبودوں کے طالب بنے ہو تو خدائے رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟ کیا تم اس بدگمانی میں مبتلا ہو کہ یہ تنہا تمہاری ضروریات کی کفالت اور تمہاری حفاظت سے قاصر ہے؟ کیا وہ اکیلا اس دنیا کے انتظام سے عاجز ہے اس وجہ سے تم نے اس کے لیے مددگار تلاش کیے ہیں؟ کیا تم اس وہم میں مبتلا ہو کہ وہ اس دنیا کے ہر گوشے اور ہر فرد کے حالات سے باخبر نہیں ہو سکتا اس وجہ سے اس کو باخبر کرنے کے لیے دوسرے وسائل و وسایط کی ضرورت ہے؟ کیا تم اس کے عدل و رحم سے مایوس ہو کہ اس کی رحمت حاصل کرنے کے لیے تم نے اپنے جی سے اس کے دربار کے لیے سفارشی ٹھہرائے ہیں؟ مطلب یہ ہوا کہ جب تک خداوندِ عالم کے بارے میں اس قسم کی کوئی بدگمانی کسی کو نہ ہو اس وقت تک وہ اس کے سوا کسی کو اپنا معبود بنانے کا ننگ گوارا نہ کرے گا! اور اگر کوئی شخص اپنے رب سے اس قسم کا کوئی سوءِ ظن رکھتا ہے تو اسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ العیاذ باللہ خدا کوئی بے حمیت و بے غیرت ہستی نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنی مملکت میں ہر ایک کی شرکت و مداخلت گوارا کر لے بلکہ وہ عزیز و جبّار اور غیور و متکبر ہے اس وجہ سے وہ ایسے تمام لوگوں کو جہنم میں جھونک دے گا جو اس کی خدائی میں شریک بننے کے مدعی ہوں گے یا دوسروں کو شریک بنائیں گے۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ۝ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ۝ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ۝ فَرَاغَ اِلٰٓى

اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۝ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ (۸۸-۹۳)

قوم کے سامنے ان کے معبودوں کی بے حقیقتی کی وضاحت

مذکورہ بالا تقریر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے، معلوم ہوتا ہے، معبد میں کسی تقریب کے موقع پر کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے یہ اسکیم بنائی کہ اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے ان کے معبودوں کی بے حقیقتی بھی طرح واضح کر دیں۔ اس کے لیے یہ طریقہ انھوں نے اختیار کیا کہ شب میں تقریب سے فارغ ہو کر جب لوگ وہاں سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے ایک نظر اس طرح ستاروں پر ڈالی گویا وقت کا اندازہ کرنا چاہتے ہوں اور لوگوں کے کانوں میں بات ڈالتے ہوئے فرمایا کہ میں اس وقت ماندہ ہو رہا ہوں۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ رات زیادہ گزر چکی ہے اور یہ نوجوان دن بھر کا تھکا ہوا ہے اس وجہ سے اس وقت گھر نہیں جانا چاہتا بلکہ یہیں معبد میں رات گزارنی چاہتا ہے۔ یہ ایک معمولی بات تھی اس وجہ سے لوگ ان کو وہاں چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب تنہائی ملی تو وہ نظر بچا کے بت خانے میں جا گھسے۔ پہلے بتوں پر کچھ طنزیہ فقرے چُست کیے کہ آخر آپ لوگوں کے سامنے یہ بھوجن جو رکھا ہوا ہے اس کو نوش کیوں نہیں فرماتے اور اس درجہ خاموشی کیوں ہے، کچھ بولتے کیوں نہیں!! اس کے بعد چند بھرپور ہاتھ ایسے مارے کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ دوسرے مقام میں ہے کہ تمام چھوٹے بتوں کو توڑ دیا صرف بڑے بت کو ایک خاص مصلحت سے، جس کی وضاحت سورۂ انبیاء میں ہو چکی ہے، چھوڑ دیا۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ اصل واقعہ کی سیدھی سادی شکل ہے جو الفاظِ قرآن سے سامنے آتی ہے لیکن مفسرین نے معلوم نہیں کس طرح اس کے تحت بعض ایسی روایتیں نقل کر دی ہیں جن سے یہ بات نکلتی ہے کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس موقع پر غلط بیانی کی اور وہ ستاروں کے مؤثر ہونے پر عقیدہ رکھتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں پر جو نظر ڈالی تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ ستارہ پرستوں کی طرح ان کی کسی تاثیر کے قائل تھے بلکہ وہ محض وقت کا اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ جب تک گھڑیوں کا رواج نہیں ہوا تھا لوگ شب میں، وقت کا اندازہ کرنا ہوتا تو، ستاروں کو دیکھتے اور دن میں سورج کو۔ اس زمانے میں جس طرح وقت معلوم کرنے کے لیے ہر شخص کی نگاہ کلائی کی گھڑی کی طرف جاتی ہے بدویانہ زندگی میں اس مقصد کے لیے ہر شخص کی نظر بے ساختہ آسمان کی طرف اٹھتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی بالکل اسی مقصد سے ستاروں پر ایک نظر ڈالی۔ اس کا کوئی تعلق نہ ستارہ پرستوں کے اوہام سے تھا اور نہ کواکب کی تاثیر سے۔

اسی طرح انھوں نے یہ جو فرمایا کہ اِنِّیْ سَقِیْمٌ تو یہ بھی انھوں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ 'سَقِیْم' عربی زبان میں مریض، ماندہ، مضمحل، نڈھال اور ضعیف و ناتواں سب کے لیے آتا ہے۔ جس کلام کے دروبست میں چستی نہ ہو اس کو بھی سقیم کہتے ہیں۔ اسی سورہ میں آگے حضرت یونسؑ کے ذکر میں ہے کہ

'فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ' (۱۴۵) ظاہر ہے کہ یہ لفظ یہاں ضعیف و کمزوری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اوپر ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ موقع معبد میں کسی میلے کا تھا۔ ایسے موقع پر ایک حد تک ماندہ و مضمحل تو ہر شخص ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت کا احساس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا اور چونکہ وہ معبد کے اندر ہی رات گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے اس وجہ سے انھوں نے آسمان پر ایک نظر ڈال کر اور یہ فقرہ فرما کر معبد کے ذمہ داروں اور محافظوں کو یہ تصور دے دیا کہ گویا وہ تکان و اضمحلال اور زیادہ رات گزر جانے کے سبب سے اس وقت گھر جانا نہیں چاہتے بلکہ یہیں پڑ رہنا چاہتے ہیں۔ اس طرح اگرچہ معبد کے اندر قیام کے لیے انھوں نے ایک توریہ کیا جس سے معبد کے محافظ مغالطہ میں پڑ گئے لیکن اس توریہ کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو طریقہ اختیار فرمایا اور جو الفاظ زبان سے نکالے اس میں نہ کسی جھوٹ کی آمیزش تھی نہ کسی بدعقیدگی کی۔ بلکہ یہ اسی طرح کا ایک پاکیزہ توریہ تھا جس کی بعض نہایت عمدہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ'

حضرت ابراہیم کے توریہ سے معبد کے پہرہ داروں کو مغالطہ

یہ رویہ بیان ہوا ہے معبد کے پہرہ داروں اور ذمہ داروں کا۔ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انداز اور ان کے فقرے سے یہ گمان کیا کہ یہ نوجوان تکان محسوس کر رہا ہے اور رات چونکہ زیادہ گزر چکی ہے اس وجہ سے اس وقت گھر جانا نہیں چاہتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ ارادہ ان کو بالکل بے ضرر محسوس ہوا اس وجہ سے انھوں نے اس میں مخل ہونا پسند نہیں کیا بلکہ ان کو چھوڑ کر وہ اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔

'فَرَاغَ اِلٰۤى اٰلِهَتِهِمْ'۔ لفظ 'رَوْغَان' عربی میں نظر بچا کر، کترا کر اور کاوا لگا کر کہیں جانے یا پہنچنے کے لیے آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے بتوں تک پہنچنے کے لیے یہ اہتمام اس وقت کیا ہے جب ان کو اندازہ ہو گیا کہ پہرے دار سو چکے ہیں۔ اس وقت وہ چپکے سے اٹھے اور دبے پاؤں، سب کی نگاہیں بچا کر، معبد کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں بت رکھے ہوئے تھے۔

'فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ'۔ پہلے انھوں نے ان پر کچھ طنزیہ فقرے چست کیے۔ فرمایا کہ یہ لذیذ کھانے اور حلوے جو آپ کے پجاریوں نے آپ لوگوں کے سامنے پیش کیے ہیں ان کو آخر تناول کیوں نہیں فرماتے! اور یہ آپ لوگ چپ چپ سے کیوں ہیں، کچھ گفتگو کیوں نہیں کرتے!

ان طنزیہ فقروں سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت یہ اقدام کیا ان پر کسی گھبراہٹ کا کوئی اثر نہیں تھا، بلکہ وہ نہایت خوشگوار موڈ میں تھے کہ ان کو، اپنی اسکیم کے مطابق، ان خداوندوں کی تواضع کرنے کا نہایت عمدہ موقع ہاتھ آ گیا اور ان کی تدبیر بالکل کامیاب رہی۔

'فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ'۔ اس جملہ کی اصل ترکیب کلام یوں ہے، 'فَرَاغَ عَلَيْهِمْ يَضْرِبُهُمْ ضَرْبًا'

بِالْیَمِیْنِ، اس وجہ سے اس کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ 'پس وہ ان پر پل پڑا، مارتے ہوئے، بھرپور ہاتھ؛ لفظ 'یمین' دہنے ہاتھ کے لیے آتا ہے اور دہنے ہاتھ کی ضرب چونکہ بھرپور ہوتی ہے اس وجہ سے یہاں یہ بھرپور ہاتھ مارنے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

فَاَقْبَلُوْٓا اِلَیْهِ یَزِفُّوْنَ (۹۴)

پہرے داروں کا رویہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ

یہاں سرگزشت کا کچھ حصہ حذف ہے جس کی وضاحت سورۂ انبیاء سے ہوتی ہے۔ جس وقت حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کو توڑا ہے اس وقت تو کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ بعد میں جب پہرے داروں کو اس حادثہ کی اطلاع ہوئی اور یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ کس کی کارستانی ہو سکتی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بتوں کی ہجو کرتے رہے تھے اور انھوں نے دھمکی بھی دے رکھی تھی کہ وہ ان بتوں کے ساتھ ایک چال کرنے والے ہیں اس وجہ سے معبد کے ذمہ داروں کی رائے یہی قرار پائی کہ ہو نہ ہو یہ انہی کی کارروائی ہے۔ چنانچہ سارے لوگ بھاگے ہوئے ان کے پاس پہنچے اور ان سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ پہلے تو انھوں نے لوگوں کا مذاق اڑایا اور بڑے بت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس نے توڑا ہوگا اور ساتھ ہی ان کی حماقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے فرمایا کہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو، اپنے ان معبودوں ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے جن پر یہ مصیبت گزری ہے! اگر یہ اپنے سر پر آئی ہوئی مصیبت کو نہ خود دفع کر سکتے اور نہ اس کو بیان ہی کر سکتے ہیں تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم ان کی پوجا کر رہے ہو! حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس معارضہ سے اول اول تو وہ بہت شرمائے لیکن پھر حمیتِ جاہلیت ان پر غالب آگئی اور بولے کہ بھلا ان سے ہم کس طرح پوچھیں، یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں! ان کے اس اعتراف کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو اچھی طرح لتاڑا جس سے برہم ہو کر انھوں نے ان کو آگ میں جلا دینے کی سازش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ سازش ناکام بنا دی۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۙ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (۹۵-۹۶)

اتمامِ حجت کے بعد قوم کو ملامت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کو یہ ملامت اس وقت کی ہے جب انھوں نے ان پر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، حجت تمام کر دی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ شامت زدو، تم اپنے ہی ہاتھوں کی گھڑی ہوئی، لکڑی اور پتھر کی مورتوں کی پوجا کرتے ہو! اللہ کی پوجا تو اس لیے کی جاتی ہے کہ اس نے ہم کو پیدا کیا ہے لیکن تمھاری عقل اس طرح ماری گئی ہے کہ تم جن کو خود اپنے ہاتھوں تراشتے ہو انہی کی پوجا کرتے ہو، گویا اپنے خالقوں کے خالق تم خود ہو۔ یاد رکھو کہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان لکڑیوں اور پتھروں کو بھی پیدا کیا ہے جن سے تم اپنے معبودوں کو تراشتے ہو اور ان جنات و ملائکہ کو بھی پیدا کیا ہے جن کے تم پیکر تراشتے ہو۔ بعض متکلمین نے 'وَمَا تَعْمَلُوْنَ' سے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی بندوں کے افعال و اعمال کا بھی خالق ہے۔ اس آیت سے یہ استدلال ہمارے نزدیک بالکل

بے محل ہے۔ ہم نے اس کی صحیح تاویل واضح کردی ہے اس وجہ سے اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ (۹۷-۹۸)

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کی سازش اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس واضح مخالفت کے بعد معبد کے ذمہ داروں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ان کو آگ میں جلا دیں لیکن یہ کام انھوں نے علانیہ کرنے کے بجائے ایک خفیہ چال کے ذریعے سے کرنا چاہا۔ یہ بات 'فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا' (پس انھوں نے اس کے ساتھ ایک چال کرنی چاہی) سے واضح ہوتی ہے 'کید' کی شکل اختیار کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ قابو سے باہر نکل سکیں اور اس کا بھی امکان ہے کہ کسی علانیہ اقدام کی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کی طرف سے کسی مزاحمت کا اندیشہ رہا ہو۔ بدویانہ دورِ زندگی میں خاندانی عصبیت بڑی اہمیت رکھنے والی چیز تھی۔ چنانچہ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک مدت تک کوئی علانیہ اقدام کرنے سے اسی اندیشہ کے سبب سے ہچکچاتے رہے۔

یہ سوال کہ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کے لیے کیا تدبیر اختیار کی ایک مشکل سوال ہے قرآن اور تورات میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس کی روشنی میں اس سوال کا قطعی جواب دیا جا سکے۔ زیر بحث آیات سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ بت خانے کے پروہتوں نے یہ اسکیم بنائی کہ ایک آتشکدہ بنا کر اس میں حضرت ابراہیمؑ کو کسی بہانے لے جایا جائے اور پھر ان کو آگ میں جھونک دیا جائے۔ قرآن کے دوسرے مقام سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کو آگ میں ڈالا بھی گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و رحمت سے ان کو آگ کے ضرر سے محفوظ رکھا اور دشمنوں کی چال ناکام ہوئی۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ (۹۹)

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت

اس واقعہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر وہاں سے ہجرت کا ارادہ فرما لیا۔ ہجرت کا فیصلہ ایک بڑا اہم فیصلہ ہوتا ہے۔ نبی اپنے ماحول سے کٹ کر ایک بالکل نئے ماحول میں داخل ہونے کا ارادہ کرتا ہے اور کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ نیا ماحول اس کے لیے سازگار ثابت ہوگا یا ناسازگار۔ اس وجہ سے اس راہ میں اس کا تمام تر اعتماد اللہ تعالیٰ ہی کی دستگیری و رہنمائی پر ہوتا ہے۔ یہاں 'سَيَهْدِينِ' کے لفظ سے اسی اعتماد کا اظہار ہو رہا ہے کہ اگرچہ حالات بالکل پردے میں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ رہنمائی فرمائے گا۔ اس کا وعدہ ہے کہ جو لوگ اس کی راہ میں جدوجہد کریں گے وہ ان کے لیے راہ کھولے گا۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ (۱۰۰)

اچھے ساتھیوں کی تمنا

اپنے خویش و اقارب اور خاندان و قبیلہ سے کٹنے کے بعد سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت محسوس

ہوتی ہے وہ اچھے ساتھی ہیں۔ چنانچہ ہجرت کے ساتھ ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی کہ اے رب! ان برے لوگوں کی جگہ تو مجھے اچھے ساتھی دے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا میرے نزدیک صرف صالح اولاد ہی کے لیے نہیں بلکہ اچھے رفیقوں اور مددگاروں کے لیے بھی تھی جن میں صالح اولاد بدرجۂ اولیٰ شامل ہے۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ (۱۰۱)

دعا کی قبولیت اور حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت کی بشارت

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور ان کو ایک فرزند کی ولادت کی خوش خبری دی گئی۔ اس فرزند سے ظاہر ہے کہ حضرت اسماعیلؑ مراد ہیں۔ اس کے بعض وجوہ بالکل واضح ہیں۔

۱۔ اس کی اول وجہ یہ ہے کہ یہی حضرت ابراہیمؑ کی اس وقت اکلوتی اولاد تھے جس کے لیے انھوں نے دعا فرمائی تھی۔ حضرت اسحاقؑ کے متعلق اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لیے دعا نہیں فرمائی تھی، بلکہ وہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے انعام کے طور پر، ان کو عطا ہوئے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آگے ان کی قربانی کا ذکر آرہا ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے قربان حضرت اسماعیلؑ کو کیا نہ کہ حضرت اسحاقؑ کو۔ اس واقعہ میں یہود نے جو تحریفات کی ہیں ان کا پردہ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے رسالۂ ذبیح میں پوری طرح چاک کر دیا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کا مطالعہ فرمائیں۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس فرزند کی صفت یہاں 'حلیم' آئی ہے۔ یہ صفت ان کی اس عزیمت واستقامت کی تعبیر ہے جس کا مظاہرہ انھوں نے باپ کی چھری کے نیچے کیا اور جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو 'صادق الوعد' 'صابر' اور 'حلیم' کے القاب سے نوازا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بعینہٖ یہی صفت 'حلیم' قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے لیے بھی آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ اپنے باپ کی صفات کے سب سے زیادہ نمایاں مظہر تھے۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۰۲)

حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا واقعہ

'سعی' سے مراد یہاں دوڑنے پھرنے کی عمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ فرزند عزیز جب باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہو رہی ہے کہ اس کو اپنے رب کی خاطر قربان کر دیں۔ اوپر یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ، حضرت ابراہیمؑ کو ان کی دعا کے نتیجہ میں اس وقت ملے تھے جب وہ اپنے خاندان اور اپنی قوم کو چھوڑ کر ایک دوسرے ملک کو ہجرت فرما چکے تھے اور واحد چیز جو اس غربت میں ان کے لیے دلجمعی کا ذریعہ بن سکتی تھی ان کا یہی اکلوتا فرزند تھا۔ اس فرزند کی عمر اس وقت اتنی ہو چکی تھی کہ وہ باپ کے ساتھ چلنے پھرنے اور اس کے چھوٹے موٹے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانے لگ گیا تھا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر ۱۳ برس کی تھی۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس عمر میں بیٹا باپ کی نگاہوں میں سب سے زیادہ

محبوب ہوتا ہے۔ غور کیجیے کہ کتنا سخت امتحان ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ڈالے جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی وفاداری میں کوئی شخص اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک اپنی سب سے زیادہ عزیز چیز اس کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس امتحان میں ڈالے گئے۔ اگرچہ یہ ہدایت خواب میں ہوئی تھی اور خواب کی بات محتاج تاویل وتعبیر ہوتی ہے اس لیے حضرت ابراہیمؑ چاہتے تو اس کی کوئی تاویل کر لیتے لیکن وہ ایک صداقت شعار اور وفادار بندے تھے اس وجہ سے اس کی کوئی تعبیر نکالنے کے بجائے وہ اس کی من وعن تعمیل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

'قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی'۔ اس راہ میں پہلا قدم انھوں نے یہ اٹھایا کہ فرزند کے حوصلہ کا بھی اندازہ کر لینا چاہا۔ فرمایا کہ بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمھیں ذبح کر رہا ہوں تو تم بھی غور کر لو کہ تمھاری کیا رائے ہے؟ اسلوبِ کلام سے متبادر ہوتا ہے کہ یہ خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک سے زیادہ مرتبہ نظر آیا۔ اگر ایک ہی بار نظر آیا ہوتا تو اس کے اظہار کے لیے 'اِنِّیۡ رَاَیۡتُ فِی الۡمَنَامِ' کا اسلوب زیادہ موزوں رہتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات بھی ظاہر فرما دی کہ ہر چند یہ خواب ایک سے زیادہ مرتبہ ان کو نظر آیا ہے لیکن ہے بہرحال یہ ایک خواب تاکہ معاملہ کی اصل نوعیت بیٹے پر اچھی طرح واضح ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی عقل و فہم پر اسی وقت سے بھروسہ تھا۔ ان کو توقع تھی کہ اس معاملے میں اس کی رائے ان کے لیے صحیح فیصلہ کرنے میں مددگار ہوگی۔

'قَالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ'۔ حضرت اسماعیلؑ نے اس خواب کو خواب کے بجائے امرِ الٰہی سمجھا اور فوراً جواب دیا کہ والد ماجد! آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے آپ بے دریغ اس کی تعمیل کیجیے اور میری طرف سے مطمئن رہیے۔ ان شاء اللہ آپ مجھے پوری طرح ثابت قدم پائیں گے۔

فَلَمَّاۤ اَسۡلَمَا وَتَلَّہٗ لِلۡجَبِیۡنِ (۱۰۳)

اصل مرحلہ

اب یہ اصل مرحلہ یعنی قربانی کا بیان ہو رہا ہے۔ 'اسلام' کے معنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینے کے ہیں۔ یعنی باپ اور بیٹا دونوں امتحان کے لیے آمادہ ہو گئے۔ باپ نے بیٹے کو ذبح کر دینے کے لیے چھری نکال لی اور بیٹے نے اپنے آپ کو ذبح کر دینے کے لیے حوالے کر دیا۔ 'وَتَلَّہٗ لِلۡجَبِیۡنِ' اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔ پیشانی کے بل پچھاڑنے کی توجیہ بعض لوگوں نے یہ کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے چاہا کہ ذبح کے وقت بیٹے کا محبوب چہرہ سامنے نہ ہو تاکہ رقتِ قلب چھری چلانے میں مانع نہ ہو لیکن یہ توجیہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے جو باپ اس طرح اپنے اکلوتے اور محبوب لختِ جگر پر چھری چلانے کے لیے آستینیں چڑھا لے گا وہ اس قسم کی تسلیوں کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے بیٹے کو سجدہ کی حالت میں قربان کرنا چاہا اس وجہ سے پیشانی کے بل

پچھاڑا۔ سجدہ کی ہیئت خدا کے قرب کی سب سے زیادہ محبوب ہیئت اسلام میں بھی ہے، جیساکہ ارشاد ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (سجدہ کر اور اپنے رب سے قریب تر ہو جا!) اور اس کی یہ حیثیت قدیم مذاہب میں بھی مسلّم رہی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بیت اللہ نہ تو تعمیر ہوا تھا اور نہ عبادت کے لیے کوئی متعین قبلہ ہی تھا۔ اگر کوئی متعین قبلہ ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بھی بیٹے کو قبلہ رُخ لٹاتے جس طرح ہم جانوروں کو ذبح کرتے وقت قبلہ رُخ لٹاتے ہیں۔

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۙ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۱۰۴-۱۰۵)

امتحان میں حضرت ابراہیمؑ کی فیروزمندی

قریب تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چھری چل جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو آواز دی کہ اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا اور یہ فیروزمندی جو اس امتحان میں تم نے حاصل کی یہ تمھاری خوب کاری اور تمھارے اخلاص و احسان کا صلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خوب کار بندوں کو اسی طرح اپنے امتحانوں میں سرفرازی بخشتا ہے۔

'قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا' ہم اوپر یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ خواب میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ محتاج تاویل و تعبیر ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب جو دکھایا گیا اس کی اصل تعبیر یہ تھی کہ وہ اس بیٹے کو خدا کی نذر کر دیں۔ یہ مقصود نہیں تھا کہ اس کو وہ فی الواقع ذبح کر دیں۔ چنانچہ جب وہ بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو خواب کا جو اصل منشا تھا وہ پورا ہو گیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بشارت دے دی کہ خواب کا مقصد پورا ہو چکا اب مزید کسی اقدام کی ضرورت نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم عمل سے پہلے ہی منسوخ کر دیا انھوں نے ایک غیر ضروری تکلّف کیا ہے۔ صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

'كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ' سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ کے صدق و اخلاص اور اس کے احکام کی تعمیل کے باب میں 'احسان' کی روش اختیار کرتے ہیں، یعنی ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خدا کے ہر حکم کی تعمیل اس طرح کریں جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے، ان کو اللہ تعالیٰ یہ صلہ دیتا ہے کہ وہ اس کے بڑے بڑے امتحانوں میں شاندار کامیابیاں حاصل کرتے ہیں اور پھر اس کے صلے میں آخرت کی ابدی بادشاہی کی فیروزمندیاں پاتے ہیں۔ برعکس اس کے جن لوگوں کی روش دین کے معاملے میں فرار پسندانہ رہتی ہے وہ آہستہ آہستہ خدا کی آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ آخرت کی کامیابیوں کی راہ ان کے لیے بالکل ہی بند ہو جاتی ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ (۱۰۶)

حضرت ابراہیمؑ کی کامیابی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین

یہ حضرت ابراہیمؑ کی اس کامیابی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحسین و آفرین ہے کہ یہ کوئی معمولی امتحان نہیں تھا بلکہ بہت بڑا امتحان تھا جس میں ابراہیم علیہ السلام نے بازی جیتی! جس امتحان کو خود اللہ تعالیٰ بڑا امتحان قرار دے اس کے بڑے ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسی کامیابی حاصل کی جس کی داد خود اللہ تعالیٰ نے 'قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا' کے شاندار الفاظ سے دی تو اس میں شبہ نہیں کہ اس آسمان کے نیچے نہ اس سے بڑا کوئی امتحان پیش آیا اور نہ اس سے زیادہ شاندار کامیابی کسی نے حاصل کی۔

وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (۱۰۷)

اس قربانی کی دائمی یادگار

فرمایا کہ ہم نے اسمٰعیلؑ کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو یہ ہدایت فرمائی کہ وہ اس بیٹے کی جگہ ایک مینڈھے کی قربانی کر دیں اور یہ قربانی ایک عظیم قربانی کی شکل میں ہمیشہ ہمیش آئندہ نسلوں میں اس واقعہ کی یادگار کی حیثیت سے باقی رہے گی۔ یہی قربانی ہے جو مناسکِ حج میں شامل ہو کر حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے آج تک برابر چلی آ رہی ہے اور قیامِ قیامت تک باقی رہے گی ——— یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قربانی اگرچہ تمام ادیان میں حضرت آدمؑ کے وقت سے چلی آرہی ہے لیکن دنیا میں کسی قربانی نے یہ عظمت و اہمیت اور یہ وسعت و ہمہ گیری نہیں حاصل کی جو حضرت ابراہیمؑ کی اس قربانی نے حاصل کی۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۱۰۸)

یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر حضرت نوحؑ کی سرگزشت میں گزر چکی ہے۔ اس کی وضاحت ہو چکی ہے کہ پچھلوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک امت کو اس ملتِ ابراہیمؑ پر باقی رکھا۔ سورۂ شعراء آیت ۸۴ میں حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا گزر چکی ہے: وَاجْعَل لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ (اے رب پچھلوں میں میرا پائدار چرچا قائم رکھ) اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی اور شہرتِ دوام کی وہ سرفرازی ان کو بخشی جس کی مثال نہیں مل سکتی۔

سَلَٰمٌ عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ (۱۰۹)

یہ مستقل جملہ ہے۔ یعنی ابراہیمؑ پر اس کے اس صدق و اخلاص کے صلہ میں، دنیا اور آخرت میں سلامتی اور برکت ہے۔ لفظ 'سلام' کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے۔

كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۱۱۰)

'كَذَٰلِكَ' کا اشارہ اسی سلامتی و برکت کی طرف ہے۔ فرمایا کہ ہم اپنے خوب کار بندوں کو اسی طرح اپنی رحمتوں اور برکتوں سے نوازتے ہیں۔

إِنَّهُۥ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ (۱۱۱)

لفظ 'مُؤْمِنِیْنَ' یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ فرمایا کہ بے شک ابراہیمؑ ہمارے حقیقی مومن بندوں میں سے تھا۔ اس سے ایمان کی اصل حقیقت واضح ہوئی کہ حقیقی ایمان وہ ہے جس کے اندر اخلاص و احسان کی وہ روح ہو جس کی مثال حضرت ابراہیمؑ نے پیش کی ۔ ہر مدعی کا ایمان اللہ کے ہاں درخور اعتنا نہیں ہے۔

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (۱۱۲)

حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری

اس امتحان میں کامیابی کے صلہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دوسرے بیٹے حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوش خبری دی اور اس خوش خبری کے ساتھ ہی اس امر سے بھی آگاہ فرمادیا کہ وہ صالحین میں سے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو منصب نبوت سے سرفراز فرمائے گا۔ ان صفات کا ذکر بشارت کے ساتھ ہی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے مجرد ایک فرزند کی ولادت کوئی اہمیت رکھنے والی بات نہیں تھی۔ وہ حضرت اسماعیلؑ کو پاکر اولاد کی طرف سے بالکل مطمئن ہو چکے تھے۔ چنانچہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان کو حضرت اسحاقؑ کی خوشخبری دی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ "کاش! اسماعیلؑ ہی تیرے حضور جیتا رہے!" البتہ یہ بات ان کے لیے بشارت ہو سکتی تھی کہ پیدا ہونے والا فرزند صالح اور نبی ہو گا۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ یہود نے حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کی روایات جو گھڑی ہیں وہ بالکل بے اصل ہیں۔ حضرت اسحاقؑ قربانی کے واقعہ کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ وہ قربان ہونے والے فرزند نہیں بلکہ قربانی کا انعام ہیں جو اس دنیا میں حضرت ابراہیمؑ کو ملا۔

وَبٰرَكْنَا عَلَیْهِ وَعَلٰۤى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّیَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِیْنٌ (۱۱۳)

ضمیر مجرور کا مرجع

'عَلَیْهِ' کی ضمیر مجرور کا مرجع حضرت اسماعیلؑ ہیں۔ جن لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کو مرجع قرار دیا ہے ان کی رائے بالکل غلط ہے۔ اگر مرجع حضرت ابراہیمؑ ہوتے تو اس کے بعد 'مِنْ ذُرِّیَّتِهِمَا' کی جگہ 'وَمِنْ ذُرِّیَّتِهٖ' موزوں رہتا۔ اس لیے کہ حضرت اسحاقؑ حضرت ابراہیمؑ کے کوئی مدمقابل نہیں بلکہ انہی کی ذریت میں سے ہیں۔

حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ کے اخلاف کو ایک یاددہانی

فرمایا کہ ہم نے اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں کو اس دنیا میں برومند کیا۔ دونوں کی اولاد خوب پھولی پھلی۔ ان کی اولاد میں سے کچھ اپنے صالح باپوں کے نقش قدم پر چلنے والے خوب کار اور مخلص و مومن ہیں اور کچھ ان کے طریقہ سے بالکل منحرف ہو کر کفر و شرک میں مبتلا ہیں اور اس طرح اپنی جانوں پر کھلا ہوا ظلم ڈھانے والے بن گئے ہیں۔ یہ گویا دونوں کی اولاد —— بنی اسماعیل و بنی اسرائیل —— کو ایک برمحل یاددہانی ہے کہ وہ متنبہ ہوں کہ وہ کن پاکیزہ لوگوں کی اولاد ہیں، ان کو کیا طریقہ اختیار کرنا تھا اور وہ کہاں بھٹک رہے ہیں۔

ایک نحوی سوال کا جواب

یہاں ایک نحوی سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ 'فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ' سے جو بات

شروع ہوئی ہے وہ یہاں تک چلی آئی ہے اور یہ نہ معلوم ہو سکا کہ 'لما' کا جواب کیا ہے؟ اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ بعض اوقات 'لما'، 'اذا' اور اس نوع کے دوسرے شرطیہ جملوں میں جواب حذف ہو جاتا ہے اور متکلم کا زور کلام اس محذوف کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ یہ طریقہ خصوصیت کے ساتھ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں جواب کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہوتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال سورۂ زمر میں بھی آئے گی: 'وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتَّى إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ (۷۳)' (اور جن لوگوں نے اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے پاسبان ان کا سلام کے ساتھ خیر مقدم کریں گے کہ مبارک ہو، اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جائیے اور وہ کہیں گے شکر ہے اس اللہ کا جس نے اپنا وعدہ ہم سے پورا کیا) دیکھ لیجیے اس آیت میں بھی 'اذا' کا جواب محذوف ہے جو خود کلام کے زور سے واضح ہو رہا ہے۔ اسی طرح آیت زیر بحث میں بھی جواب محذوف ہے۔ الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں لیکن وہ خود واضح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب باپ اور بیٹے دونوں نے اپنے رب کی رضا جوئی کے لیے یہ اقدام کر ڈالا تو تصور کرو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کیسی عظیم رحمتوں کے مستحق ٹھہرے ہوں گے!

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَى مُوسَى وَهَارُونَ ۝ وَنَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۝ وَنَصَرْنَاهُمْ فَكَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ (۱۱۴-۱۱۶)

حضرت موسیٰ اور ان کی قوم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر رسول حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام ہیں جو ایک جبار دشمن کو شکست دے کر ایک عظیم الشان امت کے بانی ہوئے اور جن کی لائی ہوئی شریعت ایک مدت دراز تک ایک وسیع دنیا پر حکمران رہی۔ فرمایا کہ ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی اپنی شریعت و ہدایت کے فضل سے نوازا اور ان کو اور ان کی قوم ——— بنی اسرائیل ——— کو ایک بہت بڑی کلفت ——— فرعونیوں کی غلامی ——— سے نجات دی اور ان کی مدد کی تو بالآخر وہی غالب رہے۔ 'نَصَرْنَاهُمْ' میں ان نصرتوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو بنی اسرائیل کو من حیث القوم ان کے دشمنوں کے مقابل مصر سے نکلنے کے بعد حاصل ہوئیں۔

وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ۝ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (۱۱۷-۱۱۸)

کتاب کی شکل میں تعلیم الٰہی کا آغاز تورات سے ہوا

'کتاب مستبین' اور 'کتاب مبین' دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ اس سے مراد تورات ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کسی امت کو بھی شریعت ایک واضح کتاب کی شکل میں نہیں عطا فرمائی بلکہ لوگوں کو صرف زبانی تعلیم دی گئی۔ تورات کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ اس میں شریعت ایک مرتب و

روشن کتاب کی شکل میں دی گئی۔

تورات اگرچہ نازل تو ہوئی حضرت موسیٰ پر لیکن حضرت ہارونؑ چونکہ باقاعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شریک رسالت بنائے گئے تھے اس وجہ سے اس کے دیے جانے کے شرف میں ان کو بھی شریک فرمایا۔ اور ان دونوں ہی کی نسبت فرمایا کہ ہم نے ان کو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ اس ٹکڑے سے ضمناً ان اتہامات کی تردید ہوگئی جو یہود نے حضرت ہارون علیہ السلام پر لگائے ہیں اور جن کی تردید ان کے محل میں تفصیل کے ساتھ ہو چکی ہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِينَ ۝ سَلَامٌ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۝ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ (۱۱۹ - ۱۲۲)

یہ اسی مضمون کی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکا ہے اور جس کے ہر جزو کی وضاحت ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان دونوں رسولوں کا طریقہ بھی ان کے بعد قائم رہا۔ ان پر اللہ کی طرف سے برکت و سلامتی نازل ہوئی اور ان کے دشمن ذلیل و نامراد ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خوب کار و وفا شعار بندوں کو اسی طرح صلہ دیا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج بھی جو لوگ خدا اور اس کے دین کے لیے اس صدق و اخلاص کا ثبوت دیں گے اسی طرح وہ بھی خدا کی رحمت و برکت کے مستحق ٹھہریں گے، اللہ تعالیٰ ان کے کام کو پائداری بخشے گا، ان کی دعوت کے حامل پیدا ہوں گے اور تاریخ میں ان کا نام روشن رہے گا۔

بعض انبیاء کا ذکر اجمال کے ساتھ

یہاں تک تاریخ کے جلیل القدر انبیاء اور ان کے کارناموں کا حوالہ تھا اور ان کے ذکر میں ترتیب بالکل تاریخی ہے۔ آگے اجمال کے ساتھ حضرت الیاس، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت الیاسؑ

'الیاس' سے مراد وہی ہیں جن کا ذکر تورات میں 'ایلیا' کے نام سے ہوا ہے اور جن کا زمانہ سنہ ۸۷۵ قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ سورۂ انعام آیت ۸۵ میں ان کا نام حضرات زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے ساتھ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفات کے اعتبار سے یہ انہی انبیاءؑ کے زمرہ کے نبی ہیں۔ بعض لوگوں نے ان سے حضرت ادریسؑ کو مراد لیا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ حضرت ادریسؑ کا ذکر قرآن میں ان کے نام سے موجود ہے۔

حضرت لوطؑ

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رشتہ دار، ان کے ہم عصر اور انہی کے تربیت کردہ ہیں۔

حضرت یونسؑ

حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر سورۂ یونس اور سورۂ انبیاء میں تفصیل سے ہو چکا ہے کہ یہ غیرتِ حق کے جوش سے مغلوب ہو کر، اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہلے ہی ہجرت فرما گئے تھے جس پر ان کو عتاب ہوا اور وہ قوم کی طرف پھر واپس کیے گئے اور ان کی دعوت سے پوری قوم ایمان لائی۔

ان انبیاء کے ذکر سے مقصود

مقصود ان انبیاء کے ذکر سے بھی اسی حقیقت کو واضح کرنا ہے جو اوپر کے انبیائے عظام کے ذکر میں واضح فرمائی گئی ہے کہ ہر چند انبیاء کو وہ قوت و جمعیت حاصل نہیں ہوئی جو نوحؑ، ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کو حاصل ہوئی اور انہیں اپنے ماحول سے بالکل بیگانہ ماحول میں کام کرنا پڑا تاہم اللہ تعالیٰ نے ان کے

کام کو بھی فروغ دیا اور ان کے بعد ان کی دعوت اور ان کی ملت بھی باقی رہی۔ سب سے آخر میں حضرت یونسؑ کے ذکر کی یہ اہمیت ہے کہ دعوت حق کے کام میں عجلت، اگرچہ حمیتِ حق کے تقاضے ہی سے ہو، جائز نہیں ہے بلکہ صبر و استقلال کے ساتھ نبی کو اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کب تک کسی قوم میں زندگی کی رمق باقی ہے اور کب اس کا پیمانہ لبریز ہوا۔

وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ۝ اللَّهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ (۱۲۳-۱۲۶)

حضرت الیاسؑ کی دعوت

'بعل' اس دیوتا کا نام ہے جس کو حضرت الیاسؑ کی قوم پوجتی تھی۔ قرینہ دلیل ہے کہ شہر 'بعلبک' کا نام اسی دیوتا کی نسبت سے پڑا ہے اس لیے کہ 'بک'، مخفف ہے 'بکہ' کا جس کے معنی شہر کے ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم کو دعوت دی کہ بدبختو! بہترین خالق، اللہ کو چھوڑ کر، جو تمھارا اور تمھارے تمام اگلوں کا رب ہے، تم 'بعل' کو پوجتے ہو! 'بہترین خالق' سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ بہترین خالق ہے۔ اسی نے پیدا کیا، اسی نے تمام ظاہری و باطنی صلاحیتیں بخشیں، وہی پرورش کر رہا ہے اور وہی تم سب کا اور تمھارے تمام اگلوں کا رب ہے تو آخر اس کو چھوڑ کر بعل کو پوجنے کا کیا تک ہے؟ تمھاری خلقت اور ربوبیت میں اس کا کیا دخل ہے؟

فَكَذَّبُوهُ فَإِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ۝ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ (۱۲۷-۱۲۸)

فرمایا کہ ان کی قوم کے لوگوں نے ان کی تکذیب کر دی جس کی پاداش میں تمام مکذبین اللہ تعالیٰ کے حضور میں مجرموں کی طرح پیش ہوں گے۔ صرف وہی لوگ اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ نے اپنی بندگی کے لیے خاص کر لیا اور وہ حضرت الیاسؑ پر ایمان لائے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۱۲۹)

یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر کی سرگزشتوں کے سلسلہ میں گزر چکی ہے یعنی جن لوگوں نے الیاسؑ کی مخالفت کی ان کا تو کوئی نام لیوا باقی نہیں رہا لیکن الیاسؑ کے نام اور اس کے کام کو اللہ نے باقی رکھا۔

سَلَامٌ عَلَىٰ إِلْ يَاسِينَ ۝ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ (۱۳۰-۱۳۲)

'إِلْ يَاسِينَ' میرے نزدیک 'الیاس' کی جمع ہے اور اس سے مراد ان کے تمام آل و اتباع ہیں۔ عربی میں اس طرح جب کسی اسم کی جمع آتی ہے تو اس سے اس کے تمام اجزاء و فروع مراد ہوتے ہیں۔ قرآن میں 'طور سینین'، 'طور' کی جمع اسی اصول پر استعمال ہوئی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ نبی پر جو برکت و سلامتی نازل ہوتی ہے اس میں اس کے تمام جاں نثار ساتھی بھی شامل ہوتے ہیں۔

'إِنَّا كَذَٰلِكَ ..... الآیۃ' اس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ مقصود اس کے بار بار اعادہ سے یہ ہے کہ یہ ایک سنت الٰہی ہے۔ جو لوگ اس طرح اپنے ایمان و احسان کا مظاہرہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے

نام کو زندہ رکھتا ہے اور جو لوگ ان کی مخالفت کرتے ہیں ان کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہتا۔

وَإِنَّ لُوطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ۝ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ۝ وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِم مُّصْبِحِينَ ۝ وَبِاللَّيْلِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۳۳-۱۳۸)

حضرت لوطؑ کی دعوت

یہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کی سرگزشت کا حوالہ ہے۔ فرمایا کہ وہ بھی ہمارے رسولوں میں سے تھا۔ اس کی قوم نے بھی اس کی تکذیب کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اس کو اس کے تمام با ایمان اہل و عیال کے ساتھ اپنے عذاب سے نجات دی اور بقیہ ساری قوم کو تباہ کر دیا۔ اس کے اہل میں سے ایک بڑھیا ——— حضرت لوطؑ کی بیوی ——— ایمان سے محروم رہ جانے کے باعث پیچھے رہ جانے والوں میں سے بنی چنانچہ وہ بھی تباہ ہونے والوں کے ساتھ تباہ ہوئی۔ اس لیے کہ نبی کے ساتھ مجرد رشتہ داری کسی کے کام آنے والی چیز نہیں ہے بلکہ کام آنے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہے۔

قریش کو ایک برمحل تنبیہ

آخر میں اس ترجیع کے بجائے جو اوپر کی تمام سرگزشتوں کے ساتھ آئی ہے یہاں قریش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم ان کی بستیوں پر سے اپنے تجارتی سفروں میں برابر دن میں بھی گزرتے ہو اور رات میں بھی تو آخر اس بات پر کیوں نہیں سوچتے کہ جس خدا نے اپنے رسولوں کے مکذبین کے ساتھ ہمیشہ یہ معاملہ کیا ہے تمہارے باب میں اس کی سنت کیوں بدل جائے گی! گویا ترجیع والی بات تو یہاں از خود واضح تھی اس وجہ سے اس کی جگہ ایک مزید برمحل تنبیہ مخاطبوں کے کان میں ڈال دی گئی جس کے لیے قوم لوط کے محل وقوع نے ایک نہایت مناسب تقریب پیدا کر دی تھی۔

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ (۱۳۹-۱۴۰)

حضرت یونسؑ کی سرگزشت

حضرت یونس علیہ السلام کی سرگزشت سورۂ یونس اور سورۂ انبیاء وغیرہ میں گزر چکی ہے۔ اس سرگزشت میں تورات کے راویوں نے جو خلط مبحث کر دیا ہے اس پر اس کے محل میں ہم مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ یہ اہل نینوا کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ان کی قوم نے ان کی دعوت کی ناقدری کی تو یہ غیرت حق کے جوش میں قوم کو چھوڑ کر ایک ایسے جہاز پر سوار ہو گئے جو کسی مقام کے سفر کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا۔ راستے میں جہاز طوفان میں گھر گیا۔ جہاز رانوں نے اپنی روایت کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ جہاز میں کوئی ایسا شخص سوار ہو گیا ہے جو مجرم ہے اور جب تک وہ الگ کر کے دریا میں نہیں ڈالا جائے گا جہاز اس ورطۂ ہلاکت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ بالآخر مجرم کو متعین کرنے کے لیے قرعہ کی نوبت آئی، قرعہ حضرت یونسؑ کے نام نکلا اور وہ دریا میں پھینک دیے گئے۔ دریا میں ان کو غالباً کسی شارک نے نگل لیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تسبیح کی بدولت ان کو بچایا اور مچھلی نے ان کو ساحل کی ریت پر اگل دیا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ساحل کی شدید تمازتِ آفتاب سے ان کو بچانے کے لیے کدو کی ایک بیل اگا دی جس کے سایہ نے اس کمزوری کی حالت میں ان کی حفاظت کی۔ بالآخر جب ان کے اوسان بجا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پھر قوم کے پاس

جانے اور اس کو دعوت دینے کی ہدایت فرمائی۔ اب کے انھوں نے دعوت دی تو اہلِ نینوا کی پوری آبادی جس کی تعداد ایک بلکہ ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ تھی ایمان لائی۔

یہ سرگزشت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو اس غرض سے سنائی گئی ہے کہ وہ بھی قوم کے رویہ سے بددل نہ ہوں بلکہ دعوت کے کام میں لگے رہیں۔ نبی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و باطل کی کشمکش کے ایک محاذ پر مامور ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ خدا کے حکم کے بغیر اس محاذ سے ہٹے اگرچہ اس کا محرک کوئی نیک جذبہ ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو آزمائشیں اپنے رسول کے لیے لکھی ہیں اس کو ان سے بہر حال گزرنا ہے۔ اگر وہ آزمائش سے گھبرائے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ ایک آزمائش سے بچنے کی کوشش میں کسی دوسری اس سے بڑی آزمائش میں گرفتار ہو جائے۔ اسی طرح قوم کو جو مہلت اتمامِ حجت کے لیے ملنی چاہیے وہ بھی سنتِ الٰہی کے مطابق ضروری ہے اور یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی قوم پر کب اللہ کی حجت پوری ہوئی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے گمان کے مطابق یہ فیصلہ کر لیا کہ اہلِ نینوا ایمان لانے والے نہیں ہیں حالانکہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ پوری قوم میں ایمان لانے کی صلاحیت موجود تھی۔

حضرت یونسؑ کی لغزش کی نوعیت

اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ۔ 'اَبَقَ' سے اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جب حضرت یونسؑ قوم کو چھوڑ کر کسی دوسرے مقام کو چلے جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ حضرات انبیاء نفس کی پیروی میں تو کبھی ٹھوکر نہیں کھاتے لیکن اتباعِ حق کے جوش میں کبھی کبھی وہ بھی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں، اگرچہ یہ چیز بجائے خود بری نہیں ہے بلکہ پسندیدہ ہے لیکن حضرات انبیاء چونکہ حق کی کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اس پہلو میں بھی اگر ان سے کوئی بے اعتدالی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی ان کی گرفت فرماتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام سے اسی طرح کی لغزش صادر ہوئی۔ ان کی قوم نے جب ان کی دعوت کی ناقدری کی تو وہ آزردہ ہو کر وہاں سے چل کھڑے ہوئے کہ ایسے ناقدروں کے آگے موتیوں کے پھینکنے سے کیا حاصل! معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے کہیں جانے کا فیصلہ کیا تو فوراً ہی کسی مقام کے سفر کے لیے کوئی جہاز بھی لدا پھندا تیار مل گیا۔ 'مشحون' کے معنی ہیں لدی اور بھری ہوئی کشتی۔ اس لفظ کے لانے سے مقصود یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ وہ قوم سے بیزار ہو کر کہیں چلے جانا چاہتے تھے، ان کی تمنا کے مطابق ان کو جہاز بھی تیار مل گیا اور وہ بے درنگ اس پر سوار ہو گئے۔ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر ان کو غور کرنے اچھی طرح موقع نہیں ملا۔

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (۱۴۱)

معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کے مطابق، جس کی طرف ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، جب قرعہ ڈالنے کی نوبت آئی تو یہ خدمت انجام دینے کے لیے جہاز والوں نے حضرت یونسؑ ہی کا انتخاب کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی

ہوگی کہ جہاز میں سب سے زیادہ ثقہ اور باوقار وہی نظر آئے ہوں گے اور قرعہ کا کام ایک ثقہ آدمی ہی کے لیے موزوں تھا لیکن قدرت کی نیرنگی دیکھیے کہ قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام کا نکلا اور وہ اس فیصلۂ غیبی کے مطابق دریا میں دھکا دیے گئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'عبدِ آبق' مفرور غلام کو کہتے ہیں جو اپنے آقا کی مفوضہ ڈیوٹی چھوڑ کر بھاگا ہو۔ گویا حضرت یونس علیہ السلام ایک مفرور غلام قرار پائے اور جہاز والوں کی طرف سے اس جرم کی سزا میں دریا میں ڈال دیے گئے۔

فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ (۱۴۲)

'حوت' سے مراد کوئی بڑی قسم کی سمندری مچھلی ہے۔ سمندر میں وہیل اور شارک کے قسم کی مچھلیاں ہوتی ہیں جو آدمی کو سموچا نگل سکتی ہیں۔ اسی قسم کی کسی مچھلی نے حضرت یونسؑ کو نگل لیا۔ 'وَهُوَ مُلِيْمٌ' یعنی یہ افتاد ان کو پیش آئی تو وہ اس کے سزاوار تھے اس لیے کہ ان سے ایک ایسا فعل سرزد ہوا تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مستحق تنبیہ ٹھہرایا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ اگرچہ حضرت یونسؑ نے جو اقدام کیا تھا وہ ایک نیک جذبہ سے کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے اذن کے بدون کیا تھا اس وجہ سے اس پر ان کی گرفت ہوئی اور گرفت آدمی کے درجہ اور مرتبہ کے اعتبار سے ہوتی ہے اس وجہ سے گرفت سخت ہوئی۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۱۴۳-۱۴۴)

'مُسَبِّحِيْنَ' میں جس تسبیح کی طرف اشارہ ہے اس کی وضاحت دوسرے محل میں ہو چکی ہے کہ اس سے مراد 'لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ' کا ورد ہے۔ یہ اپنی غلطی کے اعتراف اور اللہ تعالیٰ کے استغفار کا بہترین کلمہ ہے جو حضرت یونس علیہ السلام کی زبان پر جاری ہو گیا اور اس کلمہ نے ان کو اس پکڑ سے چھڑا لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جونہی حضرت یونس علیہ السلام پر یہ حادثہ گزرا ان کو متنبہ ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب ہوا ہے اور وہ پورے دل سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کلمہ کی شان اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اسی نے ان کو بچا لیا ورنہ جس مچھلی نے ان کو نگلا تھا اسی کا پیٹ قیامت تک کے لیے ان کا مدفن بن جاتا۔

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۝ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ (۱۴۵-۱۴۶)

اللہ تعالیٰ کے حکم سے بالآخر مچھلی نے دریا کی کسی ریتی پر ان کو اگل دیا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت وہ بالکل ہی مضمحل اور نڈھال ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وہاں کدو کے قسم کی کسی بیل کا سایہ کر دیا جس کے سایہ نے ان کو دریا کے کنارے کی سخت دھوپ سے بچایا اور کچھ عرصہ کے بعد ان کے اوسان بجا ہوئے۔

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۴۷-۱۴۸)

جب ان کے اوسان بجا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پھر ان کی قوم کے پاس دعوت کے لیے

جس کی تعداد ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی اور یہ سارے لوگ اسلام لاتے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب سے بچایا اور ان کی مہلت مقررہ تک کے لیے ان کو کھانے پینے کا موقع دیا۔ 'اَوْ' 'بَلْ' کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تورات کے صحیفوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان لانے والوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔

۶- آگے کا مضمون - آیات ۱۴۹-۱۸۲

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ سورہ کا خاتمہ اسی مضمون پر ہوا ہے جس سے اس کا آغاز ہوا ہے اور قرآن کے اسلوبِ بیان کی اس خصوصیت کی طرف متعدد سورتوں میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جس مضمون سے سورہ کا آغاز ہوا ہے اسی پر اس کا اختتام بھی ہوا ہے۔

اس سورہ کا آغاز اس کی ابتدائی آیات پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے، ملائکہ کی الوہیت اور جنات کی غیب دانی کے ابطال سے ہوا ہے۔ اس کے بعد قریش کی تنبیہ کے لیے حضرات انبیاء کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام انبیاء نے اسی بات کی دعوت دی ہے جس کی دعوت آج ان کو دی جا رہی ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح کی گئی ہے کہ جن لوگوں نے رسولوں کی تکذیب کی وہ تباہی سے دوچار ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور ان کے ساتھیوں پر اپنی برکت و رحمت نازل فرمائی۔ دنیا میں بھی ان کے نام اور کام کو عزت و پائداری حاصل ہوئی اور آخرت میں بھی ان کے لیے ابدی بادشاہی کی بشارت ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون آخر میں ایک نئے اسلوب سے آیا ہے۔ پہلے مشرکین قریش کو چیلنج کیا ہے کہ تم فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کی جو پرستش کرتے ہو اور جنات اور خدا کے درمیان تم نے جو رشتہ جوڑ رکھا ہے اگر تمہارے پاس اس کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو، ورنہ خدا کے غضب سے ڈرو۔ پھر خدا کے حضور میں ملائکہ کی جو اصل پوزیشن ہے حضرت جبریلؑ کی زبانی اس کی وضاحت کرائی ہے تاکہ جو لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنائے بیٹھے اور ان کی پوجا کر رہے ہیں ان کے سامنے ملائکہ کے سب سے بڑے فرد کی زبان سے ان کی حماقت پر ضرب لگا دی جائے کہ فرشتے تو خود اپنا درجہ و مقام کیا بتاتے ہیں اور ان کے احمق پرستار ان کو کیا سمجھتے ہیں۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اللہ کے رسولوں کے لیے فتح و نصرت کا جو وعدہ ہو چکا ہے وہ تمہارے لیے بھی پورا ہو گا اس وجہ سے صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ تمہارے مخالفین عنقریب اپنا انجام دیکھ لیں گے ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۴۹-۱۸۲

فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ﴿١٤٩﴾ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ ﴿١٥٠﴾ أَلَا إِنَّهُمْ مِنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ ﴿١٥١﴾ وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿١٥٢﴾ أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى

الْبَنِينَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿۱۵۴﴾ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۵۵﴾ أَمْ
لَكُمْ سُلْطَانٌ مُبِينٌ ﴿۱۵۶﴾ فَأْتُوا بِكِتَابِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۵۷﴾ وَ
جَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ
لَمُحْضَرُونَ ﴿۱۵۸﴾ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿۱۵۹﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ
الْمُخْلَصِينَ ﴿۱۶۰﴾ فَإِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ ﴿۱۶۱﴾ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفَاتِنِينَ ﴿۱۶۲﴾
إِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيمِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَعْلُومٌ ﴿۱۶۴﴾ وَ
إِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ ﴿۱۶۵﴾ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ ﴿۱۶۶﴾ وَإِنْ كَانُوا لَيَقُولُونَ ﴿۱۶۷﴾
لَوْ أَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِنَ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿۱۶۹﴾
فَكَفَرُوا بِهِ ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۱۷۰﴾ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا
الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۷۱﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ﴿۱۷۲﴾ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ
الْغَالِبُونَ ﴿۱۷۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۱۷۴﴾ وَأَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ
يُبْصِرُونَ ﴿۱۷۵﴾ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿۱۷۶﴾ فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ
فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۱۷۸﴾ وَأَبْصِرْ
فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ﴿۱۷۹﴾ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿۱۸۰﴾
وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۸۲﴾

ترجمہ آیات ۱۴۹-۱۸۲

تو ان سے پوچھو، کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے! کیا ہم نے
فرشتوں کو عورتیں بنایا اور وہ دیکھ رہے تھے! آگاہ، یہ لوگ محض من گھڑت طور پر یہ
بات کہہ رہے ہیں کہ خدا نے اولاد بنائی ہے اور یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ کیا اس نے بیٹیوں پر

بیٹیوں کو ترجیح دی! تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو! کیا تم ہوش سے کام نہیں لیتے! کیا تمھارے پاس واضح حجت ہے! پس پیش کرو تم اپنی کتاب اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ ۱۴۹-۱۵۷

اور انھوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ اور جنوں کو خوب پتہ ہے کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ بجز ان کے جو اللہ کے خاص بندے ہیں۔ پس تم اور جن کو تم پوجتے ہو خدا سے برگشتہ نہیں کر سکتے مگر انھی کو جو جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ ۱۵۸-۱۶۳

اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک معین مقام ہے اور ہم تو خدا کے حضور میں صف بستہ رہنے والے ہیں۔ اور ہم تو اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔ ۱۶۴-۱۶۶

اور بے شک یہ لوگ کہتے رہے تھے کہ اگر ہمارے پاس پہلوں کی کوئی تعلیم ہوتی تو ہم اللہ کے خاص بندوں میں سے ہوتے۔ تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا تو وہ عنقریب جان لیں گے۔ ۱۶۷-۱۷۰

اور ہمارے خاص مُرسَل بندوں کے لیے ہمارا یہ فیصلہ پہلے سے صادر ہو چکا ہے کہ مدد کے حقدار وہی ہوں گے اور ہمارا ہی لشکر غالب رہنے والا بنے گا۔ تو کچھ دنوں کے لیے ان سے اعراض کرو اور ان کو دیکھو، وہ عنقریب دیکھ لیں گے۔ ۱۷۱-۱۷۵

کیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں! تو یاد رکھیں کہ وہ جب ان کے صحنوں میں اترے گا تو بڑی ہی بُری ہو گی ان لوگوں کی صبح جن کو اس سے آگاہ کیا جا چکا ہے۔ تو کچھ دنوں کے لیے ان سے اعراض کرو اور دیکھو، وہ بھی عنقریب دیکھ لیں گے۔ ۱۷۶-۱۷۹

تیرا رب، عزت کا مالک، ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ اور پیغمبروں پر

سلامتی ہے اور شکر کا سزاوار اللہ ہے، عالم کا خداوند۔ ۱۸۰-۱۸۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ (۱۴۹)

اس کلام کا عطف سورہ کے ابتدائی مضمون پر ہے

اس کلام کا عطف، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ابتدائے سورہ کے مضمون پر ہے۔ اگرچہ کلام کے دونوں حصوں کے درمیان باعتبار الفاظ بُعد نظر آتا ہے لیکن یہ بُعد محض ظاہری ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے کلام بالکل مربوط ہے۔ شروع میں ملائکہ اور جنات کی الوہیت کی تردید کے بعد بعینہٖ اسی 'فَاسْتَفْتِهِمْ' کے لفظ سے آیت ۱۱ میں کلام کا رخ قریش کے لیے تہدید و وعید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کی طرف مڑ گیا تھا اور وہی مضمون یہاں تک پورے تسلسل کے ساتھ جاری رہا ہے۔ اس کے ختم ہونے کے بعد اسی 'فَاسْتَفْتِهِمْ' پر عطف کر کے اصل مسئلہ کو پھر لے لیا اور فرمایا کہ ان لوگوں سے، جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر، ان کی پوجا کر رہے ہیں، پوچھو کہ تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو تو تیرے رب کے لیے انھوں نے بیٹیاں کیوں پسند کی ہیں! مطلب یہ ہے کہ اول تو خدا کی طرف بیٹوں اور بیٹیوں کی نسبت ہی ایک شدید قسم کی جہالت ہے لیکن انھوں نے جہالت پر جہالت یہ کی ہے کہ خدا کے لیے انھوں نے وہ چیز پسند کی ہے جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں۔ حالانکہ عقل و فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کی طرف اس کی شایانِ شان صفات منسوب کی جائیں اور انھوں نے صرف یہی ظلم نہیں کیا ہے کہ اس کی طرف اس کی شان کے منافی صفت منسوب کی ہے بلکہ ایک ایسی صفت منسوب کی ہے جس کو خود اپنے لیے بھی باعثِ ننگ خیال کرتے ہیں۔

أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ (۱۵۰)

یعنی اس اعتماد کے ساتھ یہ لوگ جو یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں تو آخر یہ بات کس دلیل کی بنا پر یہ کہہ رہے ہیں؟ کیا جب ہم نے فرشتوں کو پیدا کیا تو یہ لوگ وہاں موجود تھے! سورۂ زخرف میں یہی بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا ۚ أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ ۚ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ (۱۹) (کیا انھوں نے فرشتوں کو جو اللہ کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا! کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے! ان کا یہ بیان لکھ رکھا جائے گا اور ان سے اس کی پرسش ہوگی)۔

أَلَا إِنَّهُمْ مِنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ ۝ وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (۱۵۱-۱۵۲)

یعنی دلیل ان کے پاس نہ کوئی عقلی ہے، نہ نقلی اور نہ انھوں نے اس کا کوئی مشاہدہ کیا ہے۔ بس اپنے جی سے گھڑ کے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔

أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (۱۵۳-۱۵۵)

یعنی اگر اسے اولاد ہی کا شوق تھا تو سوچنے کی بات ہے کہ اس نے بیٹوں پر بیٹیوں کو کیوں ترجیح دی؟ وہ جب بیٹے بھی پیدا کر سکتا تھا تو آخر اس نے اپنے لیے وہ چیز کیوں گوارا کی جس کو تم اپنے لیے باول نخواستہ ہی گوارا کرتے ہو۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ: تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے کہ تم ایسا الٹا فیصلہ کرتے ہو۔ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ، یعنی تمھاری یہ بات صاف شہادت دے رہی ہے کہ تم ذرا بھی ہوش و گوش سے کام لینے والے لوگ نہیں ہو ورنہ آخر تم خدا کے لیے وہ بات کس طرح پسند کرتے ہو جو اپنے لیے پسند کرنے پر تیار نہیں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات اپنی صداقت کے ثبوت کے لیے کسی حجت و استدلال کی محتاج نہیں بلکہ صرف تذکّر یعنی چیتنے اور دھیان کرنے کی محتاج ہے۔ اگر کوئی شخص بالکل ہی بلید یا لاابالی نہ ہو تو وہ بادنیٰ توجہ اس کو سمجھ سکتا ہے۔

أَمْ لَكُمْ سُلْطَانٌ مُّبِينٌ ۔ فَأْتُوا بِكِتَابِكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۱۵۶ - ۱۵۷)

فرمایا کہ اگر تمھارے پاس اس کی کوئی واضح حجت ہو تو اس کو پیش کرو۔ 'واضح حجت' کی وضاحت یہاں 'کتاب' کے لفظ سے فرما دی ہے کہ اگر تمھارے پاس کسی آسمانی کتاب کی شہادت تمھارے اس دعوے کے حق میں موجود ہو تو اس کو پیش کرو۔ خدا کے باب میں کسی کو کوئی بات من گھڑت طور پر کہنے کا حق نہیں ہے۔ بلکہ صرف دلیل و برہان کی بنیاد پر کہنے کا حق ہے اور سب سے زیادہ واضح برہان اس کی کتاب ہو سکتی ہے جو اس نے لوگوں کی تعلیم و ہدایت کے لیے اتاری ہو۔

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ۔ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ ۔ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ (۱۵۸ - ۱۶۰)

فرشتوں کے علاوہ جنوں کو بھی انھوں نے خدا کے ساتھ جوڑ رکھا ہے

ان آیات میں سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ بطور جملہ معترضہ ہے اور إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ کا تعلق وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ سے ہے۔ قرآن میں متعدد نظیریں موجود ہیں کہ جب کسی بات کی فوری تردید کی ضرورت ہوتی ہے تو تردید اصل سلسلۂ کلام کے بیچ میں آ جاتی ہے۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ بات ایسی گھنونی ہے کہ متکلم کو اس کی تردید کے معاملہ میں اتنا توقف بھی گوارا نہیں کہ اس کی بات پوری ہو لے۔

آیات کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے صرف یہی غضب نہیں کیا ہے کہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنایا ہے بلکہ اس سے بھی بڑا ستم یہ کیا ہے کہ جنوں اور خدا کے درمیان بھی انھوں نے رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ فرشتوں کو انھوں نے خدا کی ذات میں شریک بنایا ہے اور جنات کو خدا کے حقوق اور اس کی صفات میں۔ عبادت خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے لیکن یہ بد قسمت لوگ جنوں کو نافع و ضار اور علم غیب کے حصول کا ذریعہ مانتے اور اس وہم کی بنیاد پر ان کی عبادت کرتے اور ان کے لیے قربانیاں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں۔

'وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ' یعنی یہ بالکل مدعی سست اور گواہ چست' والی بات ہے، جنات کو تو اچھی طرح علم ہے کہ وہ خدا کی مخلوق ہیں اور ان کو اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے ایک دن اپنے رب کے حضور میں حاضر ہونا ہے اور جو ان میں مجرم ہوں گے وہ اپنے جرم کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہوں گے لیکن ان لال بجھکڑوں نے ان کو خدائی میں شریک مان کر ان کی پوجا شروع کر رکھی ہے۔

ایک جملہ معترضہ — 'سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ' یہ بات نہایت گھنونی تھی کہ جنات کو خدا کے ساتھ جوڑ دیا جائے اس وجہ سے بلاتوقف اس کی تردید فرما دی کہ خدا کی ذات والاصفات اس قسم کی تمام نسبتوں سے پاک ہے، نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے، نہ صفات میں۔ وہ اپنی ذات و صفات میں بالکل وحدہٗ لاشریک ہے اس وجہ سے وہ اپنے حقوق میں بھی بالکل یکتا اور لاشریک ہے۔

'اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ' یہ استثنا 'اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ' سے ہے۔ چونکہ 'مُحْضَرُوْنَ' کے اندر یہ مفہوم موجود ہے کہ خدا کے حضور سب مجرموں کی طرح گرفتار کر کے حاضر کیے جائیں گے اس وجہ سے اس استثناء کے ذریعہ سے یہ بات واضح فرما دی کہ اس سے صرف وہی بچیں گے جن کو اللہ اپنی توفیق بخشی سے اپنی سنت کے مطابق، اپنی بندگی و اطاعت کے لیے خاص کر لے اور وہ شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہ جائیں۔

زمخشری کو معلوم نہیں کیا مغالطہ پیش آیا کہ یہاں انھوں نے جنوں سے فرشتوں کو مراد لیا ہے۔ ہم نے آیات کی صحیح تاویل واضح کر دی ہے، اس وجہ سے اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ قرآن میں ملائکہ اور جنات کا ذکر دو بالکل مختلف الجنس اور مختلف الصفات مخلوقات کی حیثیت سے ہوا ہے، ان دونوں کو ایک قرار دینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جنات اپنی خلقت کے اعتبار سے انسان کے بالمقابل ملائکہ سے قریب تر ہیں اس لیے کہ جنات کی خلقت نار سے ہوئی ہے، فرشتوں کی نور سے اور انسان کی مٹی سے۔

فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ۝ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ (۱۶۱-۱۶۳)

اللہ تعالیٰ کی آزمائشیں صرف امتحان کے لیے ہیں — بعض اہل تاویل نے 'عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ' میں 'علی' کو خلاف کے مفہوم میں لیا ہے اور ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے۔ مجھے اس پر جزم نہیں ہے لیکن اگر یہ توجیہ قبول کر لی جائے تو ان آیات میں جنات پرستوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ تم اور تمھارے یہ معبود دونوں مل کر، اپنے اس فتنے کے ذریعے سے جو تم نے کھڑا کیا ہے، خدا سے صرف انھی لوگوں کو برگشتہ کر سکتے ہو جو اپنی بداعمالیوں کے باعث خود جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ گویا جو بات ابلیس کے چیلنج کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمائی تھی کہ تیرا زور صرف انھی پر چلے گا جو تیری پیروی کرنے والے بنیں گے، میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا، وہی بات یہاں دوسرے الفاظ میں فرما دی گئی ہے اور مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام میں یہ آزمائشیں جو رکھی ہیں یہ لوگوں کو گمراہی میں ڈالنے کے لیے نہیں، بلکہ محض امتحان

کے لیے ہیں۔ اللہ کے جو بندے اس امتحان میں پورے اترنے کی کوشش کریں گے، شیطان اور اس کے پرستار ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

ضمیر مجرور کے مرجع سے متعلق فراہی کا رائے

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ضمیر مجرور کا مرجع 'مَا تَعْبُدُوْنَ' ہے۔ ان کے نزدیک تاویل یہ ہے کہ تم اپنے ان معبودوں پر صرف انہی لوگوں کو مفتون بنا سکتے ہو جو خود جہنم ہی میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس تاویل پر بھی مجھے پورا جزم نہیں ہے۔ میں نے اس کا حوالہ صرف اس لیے دے دیا ہے کہ جو اصحاب علم ان آیات پر غور کرنا چاہیں وہ اس کو بھی سامنے رکھیں۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۙ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۚ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ (۱۶۴-۱۶۶)

فرشتوں کی حیثیت سے متعلق حضرت جبریلؑ کا بیان

فرشتوں کی حیثیت سے متعلق اوپر جو باتیں بیان ہوئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اب ان آیات میں فرشتوں کے گل سرسبد، حضرت جبریل امینؑ اللہ تعالیٰ کے حکم سے براہ راست اپنی اور تمام ملائکہ کی حیثیت واضح فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ان کا مرتبہ و مقام کیا ہے اور اس کی بارگاہ میں وہ کن اعمال و اشغال میں مشغول رہتے ہیں۔ مقصود اس سے ان لوگوں کی تفضیح ہے جو فرشتوں کو خدائی میں شریک مان کر ان کی پرستش کر رہے تھے کہ وہ سن لیں کہ تمام فرشتوں کے سردار کا بیان کیا ہے اور یہ احمق لوگ فرشتوں کو کیا بنائے بیٹھے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن میں متعدد نہایت واضح مثالیں اس کی موجود ہیں کہ اثنائے کلام میں کوئی بات براہ راست حضرت جبریلؑ کی زبانی کہلا دی گئی ہے۔ اس کی نظیر مطلوب ہو تو سورۂ مریم کی آیات ۶۴-۶۵ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا گیا ہے جہاں بات حضرت جبریلؑ کی زبان سے کہے جانے کے باعث زیادہ مؤثر اور بلیغ ہو گئی ہے۔ یہ موقع اسی قسم کا ہے۔ جو لوگ فرشتوں کے شریک خدا ہونے کے وہم میں مبتلا تھے ان کے وہم پر ضرب لگانے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر چیز یہی ہو سکتی تھی کہ خود حضرت جبریلؑ ان کے آگے اپنی اور پورے زمرۂ ملائکہ کی حیثیت واضح کر دیں۔ اس مقصد کے لیے حضرت جبریل علیہ السلام کی شہادت سے بڑی شہادت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اب دیکھیے کہ حضرت جبریلؑ کیا فرماتے ہیں۔

'وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ'۔ وہ پہلی بات یہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کا دائرۂ کار معین اور اس کی رسائی محدود ہے۔ وہ اپنی نسبت بھی یہی بیان دیتے ہیں کہ ان کی رسائی کی بھی ایک خاص حد ہے اس سے باہر وہ بھی نہیں جا سکتے۔ اس مسئلہ پر سورۂ فاطر کی آیت ۱ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کی حیثیت خدا کے محکوم و تابعدار ایلکاروں کی ہے۔ وہ نہ اپنے حدود سے باہر پر مار سکتے، نہ کسی امر میں خدا کے اذن کے بغیر دخل دے سکتے، نہ کوئی کام بطور خود کرنے کی جرأت کر سکتے۔ اب کتنے احمق ہیں وہ لوگ جو خدا کے ان محکوم

بندوں کو شریک خدائی مان کر ان سے یہ توقع لیے بیٹھے ہیں کہ وہ ان کے لیے جو چاہیں کر سکتے ہیں یہاں تک کہ خدا بھی اگر ان پر ہاتھ ڈالنا چاہے گا تو وہ اس سے بھی ان کو بچا لیں گے۔

'وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ ۝ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ'۔ دوسری بات انھوں نے یہ فرمائی کہ ہم ہر وقت اس کے حضور میں صف بستہ رہنے والے اور اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔ فرشتوں کی صف بستگی کا ذکر اس سورہ کی پہلی ہی آیت میں ہوا ہے اور اس کے تحت ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ 'مُسَبِّحُونَ' سے مقصود وہی چیز ہے جو سورہ کے شروع میں 'تَالِيَاتِ ذِكْرًا' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ عرش الٰہی کے ارد گرد فرشتوں کی نماز ہے جو عبدیت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ وہاں اس کو 'ذکر' سے تعبیر فرمایا ہے، یہاں 'تسبیح' سے اور قرآن میں نماز کی تعبیر ان دونوں ہی لفظوں سے ہوئی ہے۔ 'تسبیح' میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے یعنی خدا کو ان تمام باتوں سے ارفع و منزہ قرار دینا جو اس کی شان کے منافی ہیں۔

حضرت جبریلؑ نے یہ لفظ استعمال کر کے گویا یہ بات واضح فرمائی کہ خدا کے شریک بننا تو درکنار ہم تو برابر خدا کو ان تمام خلافِ شان باتوں سے پاک قرار دینے میں سرگرم رہتے ہیں۔

وَإِنْ كَانُوا لَيَقُولُونَ ۝ لَوْ أَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِنَ الْأَوَّلِينَ ۝ لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۝ فَكَفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۱۶۷-۱۷۰)

قریش کی ایک تعلّی

یہ مضمون پیچھے سورۂ فاطر کی آیت ۴۲ میں بھی گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ قریش کے سامنے جب یہ بات آتی کہ یہود اور دوسری قوموں نے اپنے اپنے نبیوں اور رسولوں کی تکذیب کی تو وہ بانداز تعلّی کہتے کہ بڑے ہی بدقسمت تھے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی، اگر ہمارے پاس اگلوں کی کوئی تعلیم ہوتی یا ہمارے پاس اللہ کا کوئی رسول آتا تو ہم یہ رویہ نہ اختیار کرتے بلکہ ہم اس کی تعلیم کی پیروی کرتے اور خدا کے نہایت خاص بندے بن کر دکھا دیتے۔ آدمی کو جو چیز حاصل نہ ہو اس کے متعلق وہ یہی دعویٰ کرتا ہے کہ اگر مجھے یہ چیز حاصل ہو جائے تو میں یہ کارنامے کر کے دکھا دوں گا لیکن جب وہ اس کو حاصل ہو جاتی ہے تو اکثر حالات میں وہ اگلے نالائقوں سے بھی بڑھ کر نالائق ثابت ہوتا ہے۔ آج کتنے لوگ ہیں جو بڑے طنطنہ کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر ان کے ہاتھ میں حکومت کی باگ پکڑا دی جائے تو وہ دنیا کو خلافت فاروقی کا جلوہ از سر نو دکھا دیں گے لیکن جب ان کا امتحان ہوتا ہے تو وہ پہلے ہی قدم پر بالکل نالائق، خائن اور چور ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم نکلتے ہیں جو اس ذمہ داری کے اہل ثابت ہوں اور ان لوگوں کے اندر تو ایک بھی اہل نہیں نکلتا جو بڑے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ اس کے مدعی بن کر اٹھتے ہیں۔ اس دنیا کی پوری تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے۔

'فَكَفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ'۔ فرمایا کہ یہ لوگ جس چیز کے متمنی اور مدعی تھے جب وہ آئی تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا اور اس کی تکذیب کے لیے طرح طرح کے بہانے تلاش کر رہے ہیں تو یہ عنقریب جان لیں گے کہ ان کی اس تکذیب کا کیا انجام ان کے سامنے آتا ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۚ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ ۚ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (۱۷۱-۱۷۳)

قریش کو ایک تنبیہ

یہ اس انجام کی طرف اشارہ ہے جس سے رسولوں کے مکذبین کو لازماً دوچار ہونا پڑتا ہے اور مقصود اس سے قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو وہی سنتِ الٰہی ان کے باب میں بھی ظاہر ہوگی جو اس سے پہلے دوسرے مکذبین کے لیے ظاہر ہو چکی ہے۔

'کلمۃ' سے مراد یہاں وہ سنتِ الٰہی ہے جو اپنے رسولوں سے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جگہ جگہ واضح فرما دی ہے۔ مثلاً

'کَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ' (المجادلۃ : ۲۱) (اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے)۔

دوسرے مقام میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ سنت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ	اور ہم لازماً اپنے رسولوں کی اور اہلِ ایمان کی
اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ	مدد کریں گے دنیا کی زندگی میں بھی اور اس دن بھی جس
یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (المومن : ۵۱)	دن گواہ گواہی دینے کو اٹھیں گے۔

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جس قوم پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی رسول کے ذریعے سے حجت تمام کی اگر وہ ایمان نہیں لائی ہے تو لازماً تباہ کر دی گئی ہے۔ رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا ظہور قوم کے لیے خدا کی عدالت کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے حق و باطل کے درمیان جو کشمکش برپا ہوتی ہے وہ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے غلبہ اور اس کے مخالفوں کی تباہی پر منتہی ہوتی ہے۔ ہم نے اس سنت کے تمام مراحل کی وضاحت اس کے محل میں کر دی ہے۔ یہاں نبی اور رسول کے اس فرق کو بھی ملحوظ رکھیے جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

'وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ' : رسول اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا لشکر بھی ہوتا ہے اور جن کے ساتھ خدا کے فرشتوں کا لشکر ہو دنیا کی کوئی قوت ان کو شکست نہیں دے سکتی۔ اس لشکر کو امتحان کے طور پر آزمائشیں تو پیش آتی ہیں لیکن فتح بالآخر اسی کو حاصل ہوتی ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰی حِیْنٍ ۙ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ یُبْصِرُوْنَ (۱۷۴-۱۷۵)

نبی صلعم کو تلقینِ صبر

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور صبر و انتظار کی تلقین ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ عرصے کے لیے ان کی زیادتیوں سے اعراض کرو تاکہ اللہ کی حجت ان پر تمام ہو جائے اور یہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں۔ تم ان کو کچھ عرصے تک دیکھو کہ یہ کیا بنا رہے ہیں، یہ بھی عنقریب دیکھ لیں گے کہ انھوں نے کیا بنایا اور اس کا انجام کس شکل میں ان کے سامنے آیا!

اَفَبِعَذَابِنَا یَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِیْنَ ۝ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰی

حِيْنٍ ۝ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ (۱۷۸ - ۱۷۹)

یعنی رسول کی تکذیب کی صورت میں ان کو جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے اگر وہ اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک وہ عذاب یا اس کا کوئی نمونہ ان کو دکھا نہ دیا جائے گا وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں تو ان کو آگاہ کر دو کہ وہ عذاب کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ وہ جب ان کے صحنوں اور میدانوں میں اترے گا تو جن کو اس سے آگاہ کیا جا چکا ہے ان کے لیے وہ وقت نہایت برا ہوگا۔ رسول کے انذار کے بعد جو عذاب آیا کرتا ہے وہ اس قوم کو ہمیشہ کے لیے پامال کر دیتا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عرب میں غارتگری کا اصلی وقت صبح کا وقت ہوتا تھا اس وجہ سے لفظ 'صباح' غارت گری اور حملہ کے مفہوم میں بھی آتا ہے اور 'واصباحا' کے نعرے میں اس کا یہی مفہوم ہے۔

اس کے بعد پھر اسی تسلی اور وعید کے مضمون کا اعادہ فرمایا جو اوپر آیات ۱۷۴ - ۱۷۵ میں گزر چکا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ ابھی کچھ دنوں اور ان کی ان ژاژ خائیوں کو نظر انداز اور انتظار کرو اور کفار کو دھمکی دی کہ جلد وہ وقت آ رہا ہے جب وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۱۸۰)

یعنی تمہارا رب جو تمام عزت و اقتدار کا حقیقی مالک ہے وہ ان تمام باتوں سے ارفع اور پاک ہے جو یہ مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس نے ان کو ان خرافات سے آگاہ اور ان کے نتائج سے باخبر کر دیا۔ اگر وہ اب بھی ان باتوں سے باز نہیں آتے تو اس کا انجام دیکھیں گے۔

وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (۱۸۱)

اوپر دوسرے رسولوں کے سلسلہ میں جس طرح سلامتی کی یہ بشارت وارد ہوئی ہے اسی طرح آخر میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بشارت ہے کہ جو سنتِ الٰہی تمام رسولوں کے لیے ظاہر ہوئی وہی تمہارے لیے ہے۔ اللہ کے رسولوں کے لیے سلامتی ہے۔ تباہی ان کے دشمنوں کے لیے ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۸۲)

اور اللہ حمد و شکر کا سزاوار ہے اس وجہ سے وہ اس کشمکشِ حق و باطل میں لازماً حق کا بول بالا کرے گا اور باطل کو شکست دے گا۔ وہ عالم کا پروردگار ہے اس کی اس پروردگاری کا لازمی تقاضا ہے کہ اس دنیا میں بھی اس کا عدل ظاہر ہو اور آخرت میں بھی اس کے عدلِ کامل کا ظہور ہو۔ یہی اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے اور اسی بنیاد پر وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سزاوار حمد ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

رحمان آباد —— ۲۹ اپریل ۱۹۷۵ء